ہمارے تجربات

حمیداللہ

ہمارے تجربات

حمیداللہ

پروین رحمٰن اور انور راشد کے نام
جنھوں نے سماجی تنظیموں میں
نئی روح پھونکی

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	پرائمری سکول	
2	دستکاری سینٹر	
3	غیر رسمی سکول	
4	ٹرِکل اَپ پروگرام	
5	گھریلو کوڑے کی صفائی	
6	سیوریج لائن پروگرام	
7	قرضہ سکیم	
8	ماحولیاتی آلودگی کا خاتمہ	
9	سیلاب میں کام	
10	ٹیچر ریسورس سینٹر	
11	ہیلتھ پروگرام	
12	غیر سرکاری اداروں کا قیام	
13	امدادی اداروں سے امداد لینا	
14	غریبوں کے لیے بستی	
15	ای گارڈ	
16	نوکری کا تجربہ	
17	بچپنے کی تعلیم	
18	تعلیم بالغاں	
19	اپنا گھر	
20	بونیر سوات میں ایک سال	
21	راتوں رات غربت کا خاتمہ	
22	سیاسی تعلیم	
23	پائیداری	
24	راولپنڈی سے اسلام آباد تک کا سفر	
25	ضامن کدہ	
26	امریکی یاترا	

کمزور لوگوں کے نام......

عوام ہی تاریخ بناتے ہیں مگر تاریخ سازی کا یہ عمل مخصوص سیاق وسباق کی حدود کا محتاج ہوتا ہے۔ یوں کبھی نہیں ہوتا کہ جو چاہا سو حاصل کر پائے مگر منزل کی طرف اُٹھنے والا ہر قدم کامیابی کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔

عوامی جدوجہد کی طویل داستانیں دنیا بھر میں موجود ہیں۔ ان داستانوں میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جنھیں ''تاریخ ساز لمحوں'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسے لمحات جب عوامی جدوجہد نے دنیا کو تبدیل کر دیا اور ایک نئی تاریخی کیفیت نے کروٹ لی ہو۔ عوامی تحریکوں میں مدوجزر آتے رہتے ہیں۔ کئی دفعہ کمیت کے حجم میں کمی بیشی ہوتی ہے مگر بعض دفعہ کمیت بالکل نئی کیفیت میں بدل جاتی ہے اسے تاریخ دان انقلاب کہتے ہیں۔ ایسے انقلاب یک لخت نہیں ہوتے بڑی لمبی تھکا دینے والی جدوجہد کا حتمی نتیجہ انقلابات ہوتے ہیں۔

پاکستانی عوام گزشتہ چار دہائیوں سے ایسی لاتناہی چھوٹی چھوٹی جدوجہدوں میں مصروف ہیں۔ ان عوامی تحاریک کی منزل ایک ہی ہے۔ یعنی ایک ایسے جمہوری ترقی یافتہ معاشرے کا استحکام جہاں جنس، قوم، رنگ، عقیدہ اور علاقہ کے باعث کسی قسم کے امتیاز کے بغیر سارے شہری پرامن زندگی گزار سکیں۔ جہاں انھیں اظہار رائے، انجمن سازی اور حق حکمرانی حاصل ہو۔ خوف، دہشت اور تنگ نظری کے ہتھیار عوام کے سروں پر نہ منڈلا رہے ہوں۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے عوام کی جدوجہد کے کئی رنگ ہیں۔ سیاسی جدوجہد انسانی وشہری حقوق کے لیے جدوجہد، معاشرتی ناہمواری کے خلاف تحریکیں سبھی تحریکیں ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

حمید اللہ اس لحاظ سے ایک عہد کی پہچان بن گئے ہیں، ان کا دور ایسی سماجی تحریکوں کے عروج کا زمانہ ہے جب غریب اور مجبور عوام نے خود کو اپنی ہمت سے طاقتور کرنا شروع کر دیا۔ اس دور کو ہم لوگوں کو طاقتور بنانے کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ جب عام لوگوں نے اپنی ابتدائی تنظیمیں بنائیں، خود کو منظّم کیا، اپنے لامحدود وسائل میں سے کچھ حصّہ اکٹھا کیا اور بڑے بڑے کام کرنے شروع کیے جنھوں نے ان کی زندگیوں کے لیے آسانیاں فراہم کیں بلکہ دوسروں کو بھی تقلید کا ذریعہ مل گیا۔

مجھے گزرے دنوں کا ایک نوجوان لڑکا ابھی تک نہیں بھولا جو پرانی بیٹریوں میں نئے سیل ڈال کر انھیں قابل استعمال بناتا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے خود کو اتنا طاقتور بنالیا کہ وہ دوسروں کے لیے ایک رول ماڈل بن گیا، پرائیویٹ پڑھ لکھ کر قانون دان تو کئی دوسرے بھی بن گئے ہیں مگر بیک وقت سماجی شعور اور سیاسی انڈرسٹینڈنگ نے حمید اللہ کو ایک نمایاں پہچان دے ڈالی ہے۔ وہ خود تو تھا ہی مگر اس کی بیوی کو 1995ء میں ''عورت فاؤنڈیشن'' کے سیاسی تعلیم کے پروگرام میں بلانے سے اس لیے منع کر دیا گیا تھا کہ این جی او والوں کے خیال میں وہ غیر سیاسی تھیں مگر وہ اب ایک بڑی سیاسی پارٹی میں ضلع کی سطح پر خواتین ونگ کی نمایاں رہنما بھی ہیں اور راولپنڈی کے ایک ٹاؤن کی نمایاں اور سرگرم کونسلر بھی رہی ہیں اور دونوں میاں بیوی کی جدوجہد کمزور لوگوں کے طاقتور ہونے کی بہترین مثال ہے۔

میں اس کتاب کی تحریر پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کے لیے مزید کامیابیوں کے لیے دُعا گو ہوں۔

——زاہد اسلام لاہور

mzahid101@yahoo.com

سماجی ترقی کے عمل ترقی سے زیادہ سماجی رہنما کا کردار اور تجربہ زیر بحث آیا کرتا ہے۔ ترقی ایک ایسا عمل ہے جس میں دیگر عوامل بھی شامل ہے تاہم ان کے درمیان ربطہ ضروری ہے۔ پاکستان میں یوں تو سماجی شبعہ کی تاریخ بہت پرانی ہے لیکن یہ شبعہ مختلف وجوہات کی وجہ سے یکجا نہیں ہوسکا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے ہم اپنے تجربات کو قلم بند کریں اور انھیں عوام تک رسائی دیں۔

ہمارے تجربات ان ہی کاوشوں میں سے ایک کاوش ہے۔ حمیداللہ جو ایک سماجی کارکن ہیں۔ انھیں تجربات (سماجی) کرنے اور خاص کر عام لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا ہنر بھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے حالات عام فہم زبان میں درج کئے ہیں۔ چاہے وہ تعلیم کا مسئلہ ہو یا طالب علم کے مسائل چاہے وہ کاروباری مسائل کا حل ہو یا غربت کے خاتمے کا ہنر، یہ کتاب عام قاری کیلئے مواد فراہم کرتی ہے۔ تاکہ یہ معاشرہ میں غربت سے لڑنے والوں کیلئے وسائل کی بھی نشاندہی ہوسکے۔ حمیداللہ نے اس کتاب میں وہ تمام حالات قلم بند کئے ہیں جس کا شکار آج کا سماجی کارکن نظر آتا ہے۔ ماحول کی آلودگی، سیلاب کی تباہ کاریاں، قرضوں کی اسکیم، ان سب شعبوں میں جو تجربات کئے ہیں وہ نئے آنے والوں اور ساتھیوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ سب سے اہم کام غیر سرکاری اداروں کا قیام ہیں۔ ان اداروں کا مقصد سماجی مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنا ہے۔ کیونکہ مسائل لاتعداد ہیں اس لیے اداروں کا بنانا، ان کو تسلسل کے ساتھ قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ اپنے غیر ملکی دورے کا ذکر بھی بہت خوب صورت انداز سے کیا ہے۔ اس دورے کی روداد سے کئی نئے خیالات جنم لیتے ہیں جو ہمیں بہتر ترقی کے مواقعہ فراہم کرتا ہے۔

مثبت تبدیلی کے لئے کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے اور اچھی کتابوں کا انتخاب اس کا لازمی جز ہے۔ آپ کی ہاتھ میں جو کتاب ہے وہ سماجی ترقی کے حوالے سے ایک کھلا سچ ہے۔ اور یہ سچ صرف تجربہ ہی ہوسکتا ہے اکثر عظیم لوگ یہ بتاتے ہیں کہ جانا کہاں ہے یا منزل کہاں ہے لیکن عظیم ترین لوگ ہمیں منزل تک لے کر جاتے ہیں۔ تو یہ کتاب بھی کچھ ایسی طرف اشارہ کرتی ہے

یہ کتاب طالب علم، سماجیات کے شعبہ جات اور سماجی تنظیموں کے لیے بہتر نسخہ ہے۔ ہمیں اس طرح راغب کرتی ہے کہ تجربہ کریں اور لوگوں تک اپنے خیالات، تجربے اور احساسات پہنچا ہیں۔

——انیس دانش

ایگزیکٹیو ممبر، ہینڈز

یہ کتاب کیوں اہم ہے؟

انقلاب فرانس اور انقلاب روس نے لفظ ''انقلاب'' میں ایسا جادو بھر دیا تھا کہ اسے دنیا بھر کے معاشروں میں تمام مسائل کے لیے اسم اعظم سمجھا جانے لگا۔ ریاست پر قبضہ کو نظام کی تبدیلی کا واحد راستہ سمجھا جانے لگا۔ یہ وہ رومانس تھا جو اشتراکی روس کے خاتمے کے بعد دم توڑنے لگا۔ تیسری دنیا اور بالخصوص ہمارے ملک میں اس بات کو نہیں سمجھا گیا کہ یہ انقلابات جو کہ خود ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ تھے دراصل پرانے نظاموں کا نقطۂ اختتام تھے۔ پرجوش تبدیلی پسند یورپی لوگوں نے رضا کاریت (volunteerism) کی بنیاد پر نئے شعور و علم، نئے نظریہ و تصور اور نئی ایجاد و دریافت کو نئے ادب، آرٹ، فلسفے، سیاست، معیشت اور سماجیت میں پروان چڑھا کر خود ہی سب کچھ بدل دیا تھا اور پرانے پسماندہ جاگیرداری اداروں سے بغاوت کر کے نئے اداروں کی تشکیل کر دی تھی، جس نے یورپ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ اشتراکی اور سرمایہ داری کی مباحث تو اسی ہمہ گیر ترقی کا اگلا مرحلہ تھیں۔

ہمارے ہاں نئے نظام کی بنیادیں انگریزوں نے پرانے اداروں کی جگہ نئے اداروں کی تشکیل پر رکھی تھیں۔ چونکہ یہ ہمارے سماجی و تاریخی مطالبات اور مادی فعالیت کا نتیجہ نہ تھا لہٰذا آج تک اس جدید ریاستی نظام کو اپنا لینے کے لیے ابھی تک تیار نہیں ہیں۔ جبکہ حقیقی ضرورت اور واحد راستہ اسی نظام کی بہتری و جدت، اس کے اداروں کی تشکیل و استحکام اور اسے قدیم پسماندہ عناصر و عوامل سے پاک کرنے میں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں پسماندگی کے باغی اور نئے شعور کے ترجمان افراد سیاسی و انقلابی تنظیموں کا رزق بنتے رہے ہیں۔ ان کا کتابی (theoratical) شعور کسی طرح کی سماجی عملیت اور مادی فعالیت کو جنم نہ دینے کے باعث pregmatic نقطۂ نظر پیدا نہ کر سکا۔ اشتراکی روس کے خاتمے اور پھر پاکستان میں شدت پسندی کے ظہور سے نئے شعور کی لہر کا اگلی نسل سے فکری رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن ایک ایسی فکری روَ ضرور برقرار رہی جو انہیں کچھ کرنے پر اکساتی رہی ہے۔ این جی اوز کی بحث سے قطع نظر آج ہمارے شہروں، دیہاتوں اور قصبوں میں ایسے نئے لوگ ہیں جو رضا کارانہ جذبے سے سرشار کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ جدید تر نظام کا چہرہ ان کی سماجی عملیت اور مادی تحرک سے ہی تخلیق ہو سکتا ہے۔

حمیداللہ پاکستان کے نئی حوصلہ مند، فعال اور رضا کارانہ جذبے سے سرشار لہر کے نمائندہ ہیں جنہوں نے پچھلے دس پندرہ سالوں میں عام لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے لئے بے شمار سروسز فراہم کیں، ادارے بنائے، پلیٹ فارم تخلیق کیے، تنظیمیں بنائی اور سماجی کردار کی نئی مثالیں قائم کیں۔ انہوں نے اس حوالے سے اپنے تمام تجربات کو زیرِ نظر کتاب میں تحریر کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں حمیداللہ نئے پاکستان کی تعمیر میں منہمک عوام دوست تبدیلی پسند رجحان میں ایک ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں ان کی کتاب ایسے افراد کے لیے ایک نصاب کی حیثیت رکھتی ہے جو عملی طور پر اس معاشرے کو بدلنے کے خواہش مند ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ اگر آپ انتہائی پسماندہ حالات اور ماحول میں بھی ہیں اور آپ کے دونوں ہاتھ خالی ہیں تو پھر بھی آپ بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔

——ڈاکٹر روشِ ندیم

تاثرات

کہتے ہیں زندہ ہاتھی ایک لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کے وزن کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے عضاء کی اہمیت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے جو اس کے مرنے کے بعد مختلف قسم کے کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہ مثال بھی حمید اللہ پر فٹ بیٹھتی ہے جب تک وہ نوکری کرتے رہے وہ کار آمد ہوں گے۔ اپنے آفس کے لیے لیکن جیسے ہی نوکری چھوڑی تو ان کے دماغ کے پرزے جنھیں نوکری کے دوران ان کے بقول زنگ لگ رہا تھا وہ پھر سے چلنے لگے۔ بے روزگار ہونے کے بعد کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد انھوں نے سوا لاکھ کی پروڈکشن شروع کر دی اور اپنے بیس سالہ تجربات جو گزشتہ دس سالوں میں بھولی بسری یادیں بن کر رہ گئی تھیں پھر سے تازہ ہونے لگیں اور انھوں نے قلم اٹھا کے اپنے تمام تجربات پر لکھنا شروع کر دیا اور روزانہ ایک تجربہ لکھنے کے لیے صبح ۰۰-۶ بجے اٹھ کے لکھنے بیٹھ جاتے۔ ۰۰-۸ بجے میں جاگتی تو میرے ہاتھ میں وہ کاغذ تھما کے بولتے لو بھئی ہمارا سلائی سنٹر کا تجربہ، ہمارا اٹریکل اَپ گرانٹ کا تجربہ، ہمارے سکول کا تجربہ و دیگر تجربات پڑھو اور جب میں انھیں پڑھتی تو کہتی کہ آپ نے تو بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ آپ نے جتنا لکھا ہے اس سے کئی گنا زیادہ جدوجہد اور عملی کام میں آپ نے تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ کئی تجربات میں ان کے ہمراہ تھی۔ اس لیے کہتی ہوں۔ لیکن ان کے تجربات اس وقت بھی ان کی ذہنی اختراع ہوا کرتے تھے اور آج بھی۔ ان کی تخلیقی کتاب کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یہ بھی ان کی محنت اور لگن کا ثبوت ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تحریر ہمیشہ مختصر مگر جامع ہونی چاہیے۔ اس کتاب میں انھوں نے مختصراً اپنے تجربات کو قلم بند کیا ہے۔ بیس سالوں کو سو صفحوں پر محیط کرنا آسان کام نہ تھا لیکن ان کی جامعیت کی بدولت یہ ہو گیا۔ اس کتاب میں وہ تمام کام جو کوئی بھی چھوٹی تنظیم، سی بی او شروع کرتی ہے اور اکثر وسائل کی کمی یا کوئی عوام کی طرف سے عدم دلچسپی کے باعث بند کر دیتی ہے۔ ان کے لیے ایک پیغام ہے کہ وہ اسے پڑھ کے سیکھیں کہ کیسے اور کتنے وقت میں کوئی منصوبہ شروع کیا جائے اور کس وقت اس کے لیے کیا وسائل اور کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ اسے مکمل اور مضبوط ہونے پر سب تجربات کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

—سمیرا گل، راولپنڈی

سرنامہ

میں عموماً کتاب خرید لیتا ہوں اور الماری میں رکھ دیتا ہوں۔ بعض اوقات کوئی کتاب ایسی ہوتی ہے جو بہت دلچسپ ہوتی ہے اور اس کے پڑھنے کا نمبر سال دو سال بعد آتا ہے۔ جب میں پڑھ لیتا ہوں تو اپنے آپ کو کوستا ہوں کہ یہ کتاب میں نے پہلے کیوں نہیں پڑھی۔

شادی کے بعد بھی میری یہی کیفیت تھی کہ مجھے یہ کتاب پہلے پڑھ لینی چاہیے تھی۔ اگر چہ یہ کتاب دو چار سال سے میری لائبریری میں پڑی ہوئی تھی۔ اب خود یہ کتاب لکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ سماجی کاموں کو دیا۔ پیغمبری کی عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہزاروں لوگوں کو فائدہ پہنچا چکا ہوں۔ بعض اوقات اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں کہ میں اپنے حصے کا کام کر چکا ہوں۔ اب جو کروں گا وہ بونس ہوگا۔ میرے بنائے گئے ادارے آج بھی خدمت میں مصروف بہ عمل ہیں اور اس وقت بھی ہزاروں لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ کتاب ان تمام تجربات پر مشتمل ہے جو میں گزشتہ بیس سال میں کر چکا ہوں۔ اس دوران میری روٹی، کپڑا اور مکان بڑے بھائی اور بھابھی کے ذمہ رہا۔

— حمیداللہ

راولپنڈی: ۲۱۔جون ۲۰۱۱ء

پرائمری سکول

میں نے محلے کے ایک سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ یہ سکول گزشتہ پندرہ سال سے ہمارے محلے میں چل رہا تھا۔لیکن اس دوران ان میں سے کوئی بچہ آٹھویں جماعت پاس نہ کر سکا۔اس کی وجہ مجھے سکول میں پڑھاتے وقت سمجھ آئی۔سکول کا مالک سرکاری ملازمت کے علاوہ دو مزید برانچیں بھی چلا رہا تھا۔جس کی وجہ سے اس کی توجہ اس سکول پر نہ رہی اور بچوں کا معیارِتعلیم زیادہ اچھا نہیں تھا۔مرد اساتذہ دن بھر بڑی کلاس کی لڑکیوں یا خواتین اساتذہ سے گپ شپ کرتے رہتے۔اس طرح بڑی کلاسوں کے بچے بھی اس عمل کو دہراتے رہتے۔سکول کے پرنسپل اور مالک فیس کی وصولی کے دنوں میں زیادہ دیر رُکتے ورنہ باقی کاموں میں مصروف رہتے۔

ہمارے پورے علاقے میں کوئی سرکاری سکول نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اور پرائیویٹ سکول،جس کی وجہ سے لوگ اس بات پر مجبور تھے کہ اپنے بچوں کو اس سکول میں تعلیم دلوائیں۔بچوں کے والدین زیادہ تر غریب تھے اور غربت کے ساتھ ساتھ اَن پڑھ بھی تھے۔جس کی وجہ سے انھیں یہ شعور نہیں تھا کہ شہر کے اندر بچوں کو اچھی تعلیم دی جا سکتی ہے۔

1990ء کے الیکشن میں یہ بات بہت زور سے سامنے آئی کہ سرکاری سکول بنایا جائے لیکن چونکہ سرکاری سکول کے لیے زمین کا ہونا ضروری تھا۔اس لیے سرکاری

سکول بنانے کے لیے فنڈز کی منظوری نہ ہو سکی۔اس دوران میں نے چند معززین علاقہ کے ساتھ مل کر ایک مہم شروع کی اور اپنے طور پر چندہ اکٹھا کیا۔ہم نے باقاعدہ سو روپے کے ٹکٹ چھاپے جس پر سر سید احمد خان کی تصویر لگائی اور پورے علاقے میں چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔بڑی مشکل سے چودہ ہزار روپے اکٹھے ہوئے جبکہ جگہ خریدنے کے لیے آٹھ، دس لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔لوگوں نے طرح طرح کی باتیں بھی بنائیں۔ہم نے اس دوران ممبر صوبائی اسمبلی وغیرہ کو بھی بلایا تا کہ وہ ہمارا یہ مسئلہ حل کر سکے۔انھوں نے صرف اتنی تسلی دی کہ میں آپ کا یہ مسئلہ صوبائی اسمبلی میں اٹھاؤں گا۔ہم لوگ سکول کے لیے زمین حاصل کرنے میں بُری طرح ناکام ہوئے لیکن ایک بات ضرور ہوئی کہ علاقے میں نیک نامی ہوئی کہ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے خلوص پر کسی کو شک نہیں تھا۔

میں اس تمام عرصے میں نہ صرف مقامی سکول میں پڑھاتا رہا بلکہ اپنا سکول بنانے کے خواب بھی دیکھتا رہا۔اس پرائیویٹ سکول میں کچھ اساتذہ میرے دوست بن گئے۔ہم لوگ سکول کے بعد ایک دوسرے کے گھروں میں گپ شپ کے لیے جاتے۔زیادہ تر موضوع خواتین اساتذہ ہوتی تھیں۔کبھی کبھار دعوت وغیرہ کے ذریعے ان کو بھی بلا لیتے تھے۔ہم نے مل کر ایک منصوبہ بنایا کہ اپنا سکول بنایا جائے۔اگر ایسے نالائق پرنسپل سکول چلا رہے ہیں تو ہمارے جیسے قابل اور ذہین لوگ اپنا سکول کیوں نہیں بنا سکتے ہیں۔طے یہ ہوا کہ دو ٹیچر فوری طور پر سکول سے استعفیٰ دے کر اپنا سکول بنائیں گے۔باقی اساتذہ وہاں سے بچے سمگل کریں گے۔یعنی نئے آنے والے بچوں کو ہمارے سکول کا راستہ دکھایا جائے گا۔سکول کا نام مشترکہ طور پر الفلاح رکھا گیا۔ہم نے مل کر ایک طالب علم کے گھر کا انتخاب کیا جس کے نیچے کا حصّہ کرائے پر حاصل کرنا تھا۔فرنیچر کے

ریٹ معلوم کیے۔سکول کے افتتاح کے وقت کا تعین کیا۔ساری تیاریاں مکمل ہوگئی لیکن اچانک مالک مکان نے مکان دینے سے انکار کردیا۔ہمارا سارا منصوبہ دھرے کا دھرارہ گیا۔ہم مایوسی کے عالم میں اپنے اپنے گھروں میں بند ہوگئے۔منصوبہ کے مطابق ہم دو ٹیچروں نے سکول سے استعفیٰ دے دیا تھا۔میرے بی۔اے کے امتحان قریب تھے۔ میں مصروف ہوگیا۔دوتین ماہ خوب تیاری کی اور امتحان سے فارغ ہوکر گھر میں جمع کیے ہوئے افسانے اور ناول پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

ایک صبح جب دیر تک سونے کے بعد اٹھا تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر نکلا تو ایک پڑوسی کھڑا تھا۔اس نے کہا آپ لوگ گزشتہ روز سکول کے لیے مکان تلاش کررہے تھے۔ ہمارے سامنے والا گھر خالی ہوگیا ہے اور اُس کا مالک مکان بھی آیا ہوا ہے۔آکر مکان دیکھ لو۔میں پھر سے سکول کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ یہ شخص گھر آیا تھا لہٰذا میں اس کے ساتھ چلا گیا۔مکان دیکھا۔مالک مکان سے ملا۔میں نے جان چھڑانے کے لیے بہت کم کرایہ بتایا۔مالک مکان نے حامی بھر لی۔اب میرے لیے مزید مشکل ہوگیا۔بہرحال آٹھ سو روپے ماہانہ پر گھر کرایے پر لے لیا۔ہمارے پاس دستکاری سینٹر چل رہا تھا۔جس کا ہم تین سو روپے ماہانہ کرایہ دے رہے تھے۔میں نے حساب کتاب لگایا۔اگر ایک ٹیچر رکھ لو اور مکان کا کرایہ دینا پڑے تو کل ملا کر ایک ہزار سے بارہ سو روپے درکار ہوں گے جس کے لیے اگر بیس روپے ماہانہ سکول کی فیس رکھی جائے تو پچاس کے قریب طالب علم درکار ہوں گے اور فلاں فلاں کے بچے ملا کر پچاس طالب علم بن جائیں گے تو ہمارا پرائمری سکول شروع ہوجائے گا۔لیکن فرنیچر کا کیا ہوگا؟ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔سکول کی زمین کے لیے جن لوگوں نے چندہ جمع کیا تھا میں نے

ان سے ملاقاتیں کیں اور اپنا پروگرام بتایا۔انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس چودہ ہزار روپے جمع ہیں، ہم آپ کو فرنیچر وغیرہ لے دیں گے۔دفتر کے لیے ایک میز اور چار کرسیاں ایک صاحب نے اپنی جیب سے بنا کر دیں۔ ہمارے محلے کے کونسلر کے پاس آفس چیئر ٹوٹی ہوئی تھی میں نے وہ اس سے مانگ لی اور مرمت کر کے پرنسپل کی کرسی بنا لی۔ پنکھے دو قسطوں میں خریدے اور ایک پرانا پنکھا کسی نے ڈونیشن دے دیا۔اس کی مرمت کی اور چھت کے ساتھ لگا لیا۔ 27۔اگست 1993ء کو سکول کا افتتاح کیا۔معززین علاقہ نے شرکت کی۔سکول کا آغاز ہوگیا۔صبح پرائمری سکول تھا، دوپہر میں دستکاری سکول اور رات کو ٹیوشن اور کراٹے سینٹر بھی۔ ہمارا ادارہ چل پڑا۔

پہلے ماہ سو کے قریب بچوں نے داخلہ لے لیا اور ہمیں ماہانہ دو ہزار روپے آمدن شروع ہوگئی۔تین ٹیچروں کے ساتھ میں اس سکول کو سپروائز کرتا رہا۔ پہلے نتیجے تک بچوں کی تعداد دو سو تک پہنچ گئی تھی۔ٹیچروں کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی۔سکول اپنی مدد آپ کے تحت چل رہا تھا۔ نئے داخلوں کے ساتھ بچوں کو کتابیں وغیرہ دیں جس سے الگ آمدنی شروع ہوگئی۔کارڈ اور بیج میں بھی آمدن تھی۔سکول سرٹیفکیٹ کی آمدنی الگ سے تھی جو کم تھی کیونکہ بچے داخل زیادہ ہورہے تھے چھوڑ کم رہے تھے۔البتہ اب ہم نے داخلہ فیس پچاس روپے لینا شروع کردی۔

سکول کے معیار کو بہتر کرنے کے لیے ہم نے مختلف اداروں سے رابطے شروع کیے۔ ہمارا پہلا رابطہ محترمہ نسرین اظہر صاحبہ سے ہوا جنھوں نے ہمیں ABES کے ایڈون سیمسن صاحب سے ملایا جو فیڈرل گورنمنٹ کے اساتذہ کو تربیت دے رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے بھی اساتذہ کو تربیت دے دی۔اس سے سکول میں بہتری آئی۔ہم نے

کچھ مقامی طریقے بھی اختیار کیے۔سکول کو مزید کامیاب کرنے کے لیے ہر بچے کو چاک دیے اور وہ گلی کے نکڑ پر الفلاح لکھتے رہیں۔اس طرح مختلف نغمے بھی لکھے۔

الفلاح الفلاح ہمیں تیری قسم
تیری راہ میں جان تک لٹا دیں گے ہم
تو غریبوں ، یتیموں کا مسکن ہے
تیرا جھنڈا جہاں میں اٹھا دیں گے ہم

ایک اور نغمہ بھی لکھا تھا۔

پڑھو لکھو ساتھیوں فلاح تمھارے ساتھ ہے
اساتذہ عظیم ہیں
یہ ماہر تعلیم ہیں
اس راہ میں جائے جان بھی تو مسکراؤ ساتھیو
پڑھو لکھو ساتھیوں فلاح تمھارے ساتھ ہے

سب سے مختصر انگریزی نظمیں اور قرآن کی سورتیں بھی بچوں کو زبانی یاد کروائیں جس سے لوگ ہمارے سکول کی پڑھائی کو بہتر سمجھتے تھے اور اپنے بچے بڑی تعداد میں داخلے کے لیے لاتے تھے۔سکول کو مزید مقبول بنانے کے لیے اُس وقت کے مشہور سٹیج فنکار اور ٹی وی اداکار کو کسی طرح اپنے سکول میں آنے کی دعوت دی جس سے علاقے میں

سکول کی مزید دھوم مچ گئی۔نامی گرامی سیاسی شخصیات کو سالانہ تقریب میں دعوت دی۔ مختلف اداروں کے لوگوں نے ہمارے پاس آنا شروع کیا۔لوگ ہمیں بڑی چیز سمجھنے لگے۔ کچھ اخبارات میں بھی خبریں لگنی شروع ہوئیں اور مختلف عالمی دنوں کو واک کی صورت میں منایا جس سے سکول کی مزید مشہوری ہوگئی۔تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔تقریباً تین سو بچے ہوگئے۔بلڈنگ چھوٹی ہوگئی۔فرنیچر کی کمی تھی۔ہم نے اپنی مشکلات نسرین اظہر صاحبہ کو بتائیں۔ان کے بیٹے اسامہ اظہر نے ہمارے سکول کے لیے ایک پروپوزل بنائی اور اسلم اظہر صاحب ہمیں ٹی وی او کے آفس لے گئے۔ چیف ایگزیکٹو اقبال جعفر سے ملاقات ہوئی۔ہم نے پروپوزل میں نوے ہزار روپے مانگے تھے۔ٹی وی او کے افسران نے ہمیں بتایا کہ ہم چھوٹی گرانٹ نہیں دیتے ہیں۔ہم نے بڑا زور لگا کر پروپوزل 138 ہزار تک پہنچائی۔انھوں نے کہا کہ ہم کم سے کم چار یا پانچ ملین روپے دیتے ہیں۔ بورڈ کو آپ کے لیے نئی قانون سازی کرنی پڑے گی۔بالآخر انھوں نے نئی قانون سازی کی اور ہمیں 138 ہزار روپے دو اقساط میں دیے۔

ہم نے اس رقم سے نیا فرنیچر خریدا، پنکھے خریدے، پانی کے کولر خریدے، نئی بلڈنگ کرایے پر لی اور سکول کو مزید بہتر کیا۔سکول کی تعداد آہستہ آہستہ مزید بڑھ گئی اور چار سو بچوں تک پہنچ گئی۔ٹوٹی کرسیاں ہٹا کر دفتر کے لیے نیا فرنیچر خریدا۔زیادہ پڑھی لکھی اساتذہ کو تعینات کیا۔سکول کی رجسٹریشن کروائی۔فیس بھی آہستہ آہستہ بڑھا دی۔بچوں کے لیے جھولے لگائے۔ایک اور بلڈنگ کرایے پر لے لی۔ٹی وی او نے ہماری کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید تین سال کے لیے فنڈ دیا جس میں غریب والدین کے لیے قرضے کا پروگرام بھی تھا۔

نئے فنڈ سے ہم نے نہ صرف موجودہ سکول کے معیار کو بہتر کیا بلکہ دو بستیوں میں مزید سکول بنائے اس طرح بیک وقت ایک ہزار کے قریب بچے ہمارے پاس زیرِ تعلیم رہے جو زیادہ تر غریب خاندانوں سے تھے۔ ایک کینیڈین فیملی ڈنیل ہمارے سکول تک پہنچے اور ہمیں تسلسل کے ساتھ حساب کی تعلیم ایک سال تک دیتے رہے جس سے ہمارے ٹیچر بہتر طریقے سے پڑھانے لگے۔ آج اس سکول کو قائم ہوئے سترہ سال ہو گئے ہیں اس میں اس وقت چار پانچ سو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور یہ سکول بغیر کسی بیرونی امداد کے چل رہا ہے اور علاقے کے بچوں کو معیاری تعلیم دے رہا ہے۔ گزشتہ دنوں میں اس بستی میں گیا تو چند نوجوانوں نے مجھے سلام کیا۔ میں نے ان سے جب حیرت کی نگاہ سے دیکھا تو انھوں نے کہا سر ہم آپ کے پاس پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے اور آج ہم گریجویشن گارڈن کالج سے کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم صرف اکیلے ہو یا کسی اور نے بھی پڑھا ہے۔ اس نے بہت سارے بچوں کے نام گنوائے کہ وہ شہر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ جو خواب میں نے دیکھا تھا اس کی تعبیر میرے سامنے کھڑی تھی۔ آج میں نہیں ہوں لیکن میرے نوجوان آٹھویں جماعت سے آگے بڑھ گئے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ سکول ہمیشہ ہمیشہ چلتا رہے گا اور اب تو اس کی مزید برانچیں بھی بننا شروع ہو گئی ہیں۔ اس تمام عمل سے جو میں نے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اداروں کی بنیاد صحیح طریقوں پر رکھی جائے تو وہ ایک نہ ایک دن نتائج دیتے ہیں اور مستقل چلتے رہتے ہیں۔

دستکاری سینٹر

ایک لیڈی کونسلر نے ہمارے علاقے کے چند نوجوانوں کو دستکاری سینٹر کا سامان دیا تھا جو بہت عرصہ تک شروع نہ ہو سکا اور اس سامان کو زنگ لگ رہا تھا۔ جب یہ بات میرے علم میں لائی گئی تو میں نے ارادہ کیا کہ سلائی سینٹر شروع کیا جائے۔ میں نے ایک جاننے والی خاتون سے بات کی کہ اس طرح ہمارے ایک دوست کے پاس سلائی سینٹر کا سامان موجود ہے لیکن باقاعدہ ٹیچر نہ ہونے کی وجہ سے وہ سینٹر بند پڑا ہے۔ اگر آپ حامی بھرتی ہیں تو میں اس سینٹر کا آغاز کرا دوں۔ سلائی کی ٹیچر نے کہا ٹھیک ہے۔

میں نے سب سے پہلے اپنے محلے میں ایک صاحب سے ایک کمرہ کرائے پر لیا جس کا تین سو روپے کرایہ تھا اور پھر سلائی مشین وغیرہ اس میں لگائی۔ سلائی سینٹر کا افتتاح کیا اور کام کا آغاز ہو گیا۔ ہم نے سلائی سینٹر کی فیس باہم مشورے سے پچاس روپے رکھی۔ پہلے مہینے کوئی بیس کے قریب لڑکیوں نے داخلہ لے لیا جس سے ہزار روپے آمدنی شروع ہو گئی اور اس کے اوقاتِ کار شام کے رکھے تا کہ صبح سکول جانے والی لڑکیاں شام کو سلائی سینٹر میں آ سکیں۔ ہزار روپے ماہانہ میں تین سو روپے کمرے کا کرایہ، پانچ سو روپے ٹیچر کی تنخواہ اور باقی رقم سلائی سینٹر میں مختلف اشیا خریدنے پر صرف کی جاتی۔ اس سینٹر کی کافی مشہوری ہو گئی اور دور دور سے لڑکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ سلسلہ سال بھر جاری رہا۔

جن نوجوانوں کے ذریعے سے سلائی سینٹر کا سامان مجھ تک پہنچا تھا انکے سیاسی

مقاصد تھے اور انھیں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا جس پر انھوں نے اس سینٹر کو بند کر دیا اور سلائی سینٹر کا سامان واپس لے گئے۔ میں تو مایوسی کے عالم میں گھر بیٹھ گیا اور چونکہ ایف اے کا طالب علم تھا تو اپنی پڑھائی پر دھیان دینے لگا لیکن سلائی کی لڑکیوں نے اس ٹیچر کو مجبور کیا کہ وہ دوبارہ کام کا آغاز کریں۔ وہ میرے پاس آئی تو میں نے کہا کہ میرے پاس تو سلائی مشین وغیرہ نہیں ہے، تو تم کیسے کام کرو گی۔ اس نے کہا کہ لڑکیاں اپنے گھروں سے سلائی مشین لے آئیں گی اور ہم کام کا آغاز کر دیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ خالی تھا، میں نے اپنے ابا سے بات کی تو انھوں نے وہ ہمیں دے دیا۔ مشین لڑکیاں گھروں سے لے آئیں، چٹائی، قینچی اور فیتا ٹیچر لے آئی، میز اور کرسی میں نے اپنے سٹڈی والی دے دی۔ اس طرح ہمارے سلائی سینٹر کا دوبارہ آغاز ہو گیا۔ لڑکیوں کی تعداد پھر بیس، پچیس تک پہنچ گئی۔ ہم نے فیس کی بچت سے دو سلائی مشینیں قسطوں پر لے لیں جن کی ماہانہ تین سو روپے قسط ادا کرتے تھے اور یہ رقم بارہ ماہ میں ختم کرنی تھی۔ اس دوران میرا رابطہ اپنی تنظیم کی رجسٹریشن کے سلسلے میں سوشل ویلفیئر سے ہوا۔ وہاں کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر فرحت افزا ایک اچھی خاتون تھی، اُس نے اسلام آباد کی ایک امیر خاتون کے ساتھ ہمارے سلائی سینٹر کا دورہ کیا۔ جنھوں نے دو مشینیں عطیے کے طور پر دے دیں۔

کافی ساری لڑکیاں کام سیکھ گئی تھیں۔ اب ان کے لیے روزگار تلاش کرنا تھا۔ میں نے موتی بازار میں ایک صاحب سے رابطہ کیا جو درزی تھا اور ریڈی میڈ بچگانہ سوٹ بھی فروخت کرتا تھا۔ اس کے پاس خواتین کے کپڑوں سے بچے ہوئے کافی سارے پیس تھے جو ایک گز یا آدھے گز کے ہوتے تھے۔ اُس نے کہا کہ ان کو میں سوٹ کے حساب سے

کاٹ کر دیتا ہوں آپ لوگ سلائی کر دیں۔ میں فی سوٹ دس روپے دوں گا۔ میں نے حامی بھر لی اور اس طرح جن لڑکیوں کو ہم نے ٹریننگ دی ان کو روزگار بھی دیا۔

نیشنل زکوٰۃ فاؤنڈیشن نام کا ایک ادارہ جن کو ہم نے سلائی سینٹر کے لیے مزید مشینیں اور فرنیچر کے لیے درخواست دی، انھوں نے طویل جدوجہد کے بعد اڑتیس ہزار روپے منظور کیے جس سے سلائی سینٹر کو چار چاند لگ گئے اور بعد میں اس ادارے کے ایم ڈی نے ہمارے سینٹر کا وزٹ کیا تو مزید نوے ہزار روپے کی منظوری دی جس سے ہم نے دو مزید سلائی سینٹر بنائے۔ اس طرح اب ہمارے تین سلائی سینٹر چل رہے تھے۔ جس میں ایک سو پچاس کے قریب لڑکیاں کام سیکھ رہی تھیں۔ ان میں سے خاص طور پر ان آبادیوں کے لیے بھی سینٹر کھولے گئے جہاں کی لڑکیاں بازار میں کاغذ چننے کے لیے جایا کرتی تھیں۔

ان لڑکیوں میں سے چند ایک کی تو جلد ہنر کی طرف راغب ہو گئی لیکن اکثر کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے گھر کا چولھا جلنا بند ہو جائے گا، اگر ہم آپ کے پاس آنا شروع کر دیں گے جس کے لیے ہم نے ایک اور ادارے سے رابطہ کیا جس کا نام ہے سی آر ایس (CRS) یعنی کیتھولک ریلیف سروس۔ یہ ادارہ ہمیں غریب خواتین کے لیے ہر ماہ پکانے کے تیل کے پانچ لیٹر کا ایک ڈبہ، ڈیڑھ کلو دال اور ایک کلو خشک دودھ دیا کرتے تھے۔ اس ترغیب سے ان لڑکیوں کو سلائی سینٹر تک لانے میں آسانی ہو گئی اور ہم نے 1990-2000 کے عشرے میں ایک ہزار کے لگ بھگ خواتین کو نہ صرف ہنر سے آراستہ کیا بلکہ شعوری تربیت بھی دی جس کے لیے ہم ماہانہ ایک سیشن رکھتے تھے جس میں انسانی حقوق کے کارکن، وکلا، علماء، ٹریڈ یونین اور دیگر لوگ شامل ہوتے تھے۔ اگر چہ

بہت کم لڑکیوں نے کمرشل کام کیا لیکن اکثریت اپنے اور گھر والوں کے کپڑے بنانے لگی۔ اگر ارادہ پختہ ہو تو بے سروسامان آپ کام کا آغاز کر دیں۔

غیر رسمی سکول

ہمارے پاس کچھ بچے رہتے تھے جو کاغذ چننے شہر جاتے تھے اور یہ بچے کاغذ اور دیگر سکریپ میونسپلٹی کے کوڑے دان سے اکٹھے کر کے دس، بیس روپے کی دیہاڑی لگاتے تھے۔ ہم نے جب ان بچوں کو سکول میں آنے کے لیے کہا تو ان بچوں کے والدین کا موقف یہ تھا کہ ہمارے بچے مزدوری کرتے ہیں، اگر یہ پڑھنا شروع کر دیں گے تو ہماری آمدن رُک جائے گی اور ہمارے گھر کے اخراجات نہیں چل سکیں گے، جس کے لیے ہم نے ان بچوں کو آپشن دی کہ وہ مزدوری سے فارغ ہو کر ہمارے سکول آ جایا کریں جس پر وہ راضی ہو گئے۔ اس طرح ہم نے پرائم منسٹر لٹریسی کمیشن کے ذریعے سے پانچ غیر رسمی سکول قائم کیے جن کی ٹیچر کو تربیت دی اور ان ٹیچروں کے گھروں پر یہ سکول بنا دیے جو ان کے گھر کی چھتوں پر یا صحن میں چلتے تھے۔ بچے صبح کاغذ چنتے یا منڈی میں جاتے اور شام کے اوقات میں پڑھنے آتے۔ تقریباً ہر ٹیچر کے پاس چالیس بچے تھے۔ اس طرح دوسو کے قریب بچے ان سکولوں میں زیر تعلیم تھے جن کو تین سالوں میں پانچ جماعتیں پاس کروانی تھیں۔

ٹیچر بچوں کو بہت محنت سے پڑھاتی لیکن لٹریسی کمشن کی طرف سے تنخواہ بہت دیر سے ملتی۔ عام طور پر تین ماہ کے بعد چوبیس سو روپے ہر ٹیچر کو ملنے چاہیے تھے لیکن یہ رقم سال سال بعد ملتی۔ ٹیچروں کی تنخواہوں کی فائلیں بیوروکریسی کی میزوں پر گھومتی رہتیں جس سے اساتذہ پڑھانے میں کم دلچسپی لیتے۔ اس مسئلے کا حل ہم نے اس طرح نکالا کہ سی

آر ایس (CRS) کی مدد سے ہم نے ان بچوں کو خوراک یعنی تیل، دودھ اور دال دینا شروع کیا جو ماہانہ پانچ سو روپے کا راشن بنتا اور اس کے بدلے میں پچاس روپے ماہانہ فیس وصول کرنا شروع کی۔ اس طرح یہ رقم اساتذہ کی تنخواہ کے لیے استعمال کی جاتی اور لٹریسی کمیشن سے جو رقم آتی وہ بونس سمجھی جاتی۔ خوراک کی وجہ سے ان بچوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا اور گھروں میں جگہ تنگ پڑنے لگی، جس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ ان غیر رسمی سکولوں کو ہم نے اپنی رسمی سکولوں کی بلڈنگوں میں شفٹ کر دیا جہاں پر شام کے اوقات میں یہ سکول چل رہے تھے یعنی صبح باقاعدہ سکول تھا جس میں یونیفارم، بیج، بیگ کی پابندی تھی اور شام کو ان پابندیوں سے پاک غیر رسمی سکول تھا۔ یہ بچے عام بچوں سے زیادہ ہوشیار اور زیادہ سمجھ دار تھے۔ حساب کتاب میں تو بہت ماہر تھے اور سیکھنے میں بہت تیز۔ سکول آنے کی وجہ سے اپنے جسم کی صفائی پر بھی توجہ دینے لگے اور خوراک کے ملنے کی وجہ سے پورا وقت پڑھائی کو دینے لگے۔ ان بچوں میں سے اکثر نے پرائمری جماعت پاس کر کے رسمی سکولوں میں داخلے لیے اور اپنی پڑھائی کو آگے بڑھایا۔

ایک دفعہ ان بچوں کے لیے کہیں سے کمپیوٹر آئے۔ ہمارے لیے مسئلہ بن گیا کہ اب کہاں سے انسٹرکٹر لایا جائے کیونکہ انسٹرکٹر کی تنخواہ کے لیے رقم چاہیے تھی۔ بہت غور وغوض کے بعد ہم نے ان بچوں کو کہا کہ وہ ہفتے میں ایک بار اپنے گھر سے بچی ہوئی سوکھی روٹیاں لایا کریں جس کے بدلے ہم ان کو کمپیوٹر سکھائیں گے۔ یہ کوئی ایک ہزار کے قریب بچے تھے۔ ہفتے میں ایک دن جو بچی ہوئی روٹی لاتے تھے وہ تقریباً ایک کلو ایک بچہ لایا کرتا تھا۔ اس طرح ایک ہزار کلو یعنی ایک ٹن سوکھی روٹیاں ہمارے پاس جمع ہو جاتی تھیں جس کی اس وقت مارکیٹ ویلیو تھی چھ ہزار روپے اور ماہانہ یہ رقم چوبیس ہزار بنتی جس

پر ہم نے ان بچوں کے لیے انسٹرکٹر کا انتظام کیا اور ان کو کمپیوٹر کی تعلیم دی۔

غیر رسمی سکولوں کے دو تین تجربات اور بھی کیے جیسے ہم نے ریلوے کواٹر میں سکول کھولے اور پہلی سے پانچویں جماعت تک الگ الگ کلاسیں لگائیں اور پورا پرائمری سکول چلایا۔

اس طرح پی آر اے ٹیکنیک سے بھی غیر رسمی سکول چلایا یعنی بچہ اپنے ماحول کی اشیاء سے سیکھ لیتا تھا۔ ان کے نام جانتا، ان کو ترتیب دیتا، ان کے نقشے بناتا، یعنی تصویریں بناتا اور خواندگی کی طرف بڑھتا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ غیر رسمی سکول تنخواہ کے زور پر چلتا ہے کہ جب تک تنخواہ مل رہی ہے تو سکول چل رہا ہے اور جب تنخواہ ملنا بند ہو جاتی ہے تو سکول بند ہو جاتا ہے لیکن اگر پیچھے کوئی ادارہ ہو تو وہ مزید طریقوں سے یہ سکول چلا لیتے ہیں۔

اس طرح یہ بات بھی درست ہے کہ کام کرنے والے بچوں کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے میں مشکلات ہوتی ہیں لیکن اگر ایک مرتبہ ان کو پڑھائی کی طرف لے آئیں تو وہ بعد میں نارمل سکولوں کی طرف خود قدم بڑھاتے ہیں۔

غیر رسمی سکول کے بچوں کو پڑھاتے وقت اس بات کا دھیان بھی رکھنا چاہیے کہ یہ بچے عام بچوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کو روایتی انداز سے پڑھانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بچے ہوشیار اور چالاک، لین دین میں بہت تیز ہوتے ہیں۔

ایک سروے کے مطابق گزشتہ دنوں جب بچوں کے سیکھنے کی صلاحیت کا امتحان لیا گیا تو وہ بچے جو سکول سے باہر تھے، زیادہ سیکھنے میں تیز تھے بہ نسبت ان بچوں کے جو

با قاعدہ رسمی سکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بنیادی ضرورت تو بچوں کو پڑھنے لکھنے اور حساب کی صلاحیت سکھانی ہوتی ہے اس کے لیے کوئی بھی طریقہ استعمال کر کے ان صلاحیتوں کو بہتر کیا جا سکتا ہے جس میں ایک غیر رسمی سکول کا طریقہ ہے۔ ہمارے تجربے میں یہ بات آئی کہ بنیادی خواندگی کے لیے با قاعدہ عمارت، یونیفارم، کپڑے اور جوتے ہونے ضروری نہیں۔ آپ کہیں پر اپنا سکول شروع کر سکتے ہیں اور بچوں کو بنیادی علم منتقل کر سکتے ہیں کیونکہ عمارت اور دیگر لوازمات سے تعلیم مہنگی ہو جاتی ہے اور غریب آدمی کے بس میں نہیں رہتی۔ اس طرح تعلیم کے اوقات اور جگہ کے مقرر کرنے سے بھی وہ بچے جو والدین کے کفیل ہوتے ہیں نہیں آ سکتے۔

ٹرکل اَپ پروگرام

ٹرکل اَپ پروگرام کا آئیڈیا ہمیں ابرار شاہ نے دیا۔ ابرار شاہ نے اپنے گاؤں ہری پور حطار میں ایک تنظیم بنائی ہوئی تھی۔ جس کا نام راولپنڈی ڈویلپمنٹ پراجیکٹ ہے۔ ان دنوں عمر اصغر خان کی وجہ سے ڈونر کی اکثریت کا رُخ ہزارہ کے علاقے کی طرف ہوتا تھا۔ ٹریکل اَپ پروگرام کا ایک نمائندہ اشوک کمار ہزارہ کے دورے پر آیا اور اس پروگرام کے مخصوص فارم تقسیم کیے۔ ابرار شاہ راولپنڈی ریلوے کیرج فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا اور میرے ساتھ کبھی کبھار ٹھہرتا۔ رات گزارتا، کھانا کھاتا اور اس کے بدلے کسی ڈونر کا ایڈریس دے جاتا۔ یہ فارم بھی وہی دے گیا تھا۔ ہم نے بھی مذاق ہی مذاق میں پُر کر دیا اور روانہ کر دیا۔

ٹرکل اَپ پروگرام کا ہیڈ آفس نیویارک میں ہے۔ یہ لوگ سو ڈالر کی گرانٹ ایک فرد کو کسی تنظیم کے ذریعے دیتے ہیں۔ جو دو اقساط میں ہوتی ہے۔ یعنی پچاس ڈالر پہلے اور پچاس ڈالر بعد میں اور یہ رقم چھوٹے کاروبار کے لیے ہوتی تھی۔

پہلے دس نام تو ہم نے عزیزوں، رشتہ داروں کے بھیجے تھے۔ جس میں ایک آدھ نے اچھا کام کیا اور باقی لوگ مال مفت ہڑپ کر گئے۔ اگلی دفعہ کچھ نئے تجربات کی سوجھی۔ کیرج فیکٹری کالونی کے افراد کو دیے اور ساتھ مرغیوں کی ٹریننگ بھی دی لیکن وہ بھی خدا کے بندے یہ ڈالر ہڑپ کر گئے۔ تیسری مرتبہ ہم نے لوگوں کو نقد رقم نہیں دی بلکہ

ریڑھیاں بنا کر دیں جس پر لوگ سبزی یا فروٹ بیچا کرتے تھے۔ یہ تجربہ کامیاب ہوا۔ کم از کم ریڑھی نظر تو آتی تھی اور وہ شخص کسی اور کو بیچ یا دے بھی نہیں سکتا تھا۔ غالباً اس وقت سو ڈالر میں دو ریڑھیاں آ جاتی تھیں۔ جس سے دو خاندانوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں اکثر و بیشتر ان لوگوں سے انٹرویو کرتا رہتا تھا۔ اچھا آج کیا فروخت کیا۔ وہ بتاتے تھے کہ پانچ سو روپے کا پیاز لایا تھا اب تک 800 روپے ہو گئے ہیں اور یہ مال بھی باقی ہے۔ اس طرح وہ 500 روپے کی چیز سے ہزار روپے بنا لیتے تھے جو ان کی گھریلو ضروریات کے لیے کافی رقم تھی۔ اس طرح پہلی دفعہ ہمارا یہ تجربہ کامیاب ہوا۔ اگلے تجربے کے لیے ہم نے اردگرد کے دیہاتوں کو منتخب کیا۔ عام طور پر مضافات کے دیہات اگر شہروں کو دودھ اور گوشت کی اشیاء دیں تو شہریوں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور دیہاتی بھی خوشحال ہوں گے۔ اس فلسفے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے دس کے قریب دیہاتوں میں دس دس عورتوں کے گروپ بنائے اور ہر گروپ کو ٹریننگ دی اور ٹریکل اَپ پروگرام سے ان کو ایک ایک بکری لے کر دی اور یہ ہم نے خود خرید کر دی کیونکہ نقد رقم دینے کا تجربہ ہمیں ہو چکا تھا۔ ابتداء میں بکریوں کی خریداری میں ہمیں مہارت نہیں تھی اور پہلے گروپ کو جو بکریاں دیں وہ کمزور اور لاغر تھیں جس پر دیہاتیوں نے بہت محنت کی لیکن بعد میں ہم تجربہ کار ہو گئے اور ایسی بکریاں خرید کر دیں جو بچہ دینے کے قریب تھیں۔ اس پروگرام میں ہماری دیہاتیوں کے ساتھ یہ شرط تھی کہ وہ بکری کا پہلا بچہ واپس کریں گے اور باقی بکری ان کی ہو جائے گی۔ یہ پہلا بچہ ہم کسی اور خاتون کو دے دیا کرتے تھے۔ اس شرط پر اس طرح یہ سلسلہ نہ صرف پورے گاؤں میں بلکہ اردگرد کے گاؤں تک پہنچ گیا تھا۔ اس تجربے میں دو لوگوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جس کو فائدہ ہوا۔ ایک بیوہ عورت تھی جو اکیلی تھی یعنی اس کا نہ تو بچہ تھا اور نہ ہی کوئی اور عزیز رشتہ دار، اس کو ہم نے اس پروگرام سے بکری دی اور بچہ اس نے ہمیں

واپس کر دیا اور باقی کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایک دفعہ وہ شدید بیمار ہوئی جس کے لیے اس نے اپنے دو بکریاں فروخت کیں اور علاج کروایا۔ اس طرح جب ہم یہ بکریاں دیتے تھے تو عورتیں خوش تھیں کہ ایک خاتون جو اپنے میاں سے جھگڑ کر میکے بیٹھ گئی تھی میاں اسے بکری کی لالچ میں واپس لے آیا اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس پروگرام میں ہمارے ایک دوست محمد خان نے ہماری تکنیکی معاونت کی۔

ان دیہاتوں تک پہنچنے کا جو ذریعہ ہم نے استعمال کیا وہ یہ تھا کہ ہمارے جاننے والے افراد تھے جو کسی نہ کسی کام کاج کے سلسلے میں آتے تھے جس سے ان سے شناسائی تھی۔ ان کے ذریعے ہم ان کے گاؤں تک پہنچتے اور وہاں خواتین کو یہ پروگرام دیا۔ جو کامیاب رہا۔ البتہ پہلے بچہ کی واپسی پر عورتیں جلدی بہت کرتی تھیں، آپ اپنا پہلا بچہ لے جائیں تاکہ ہماری ذمہ داری ختم ہو جائے جس کے لیے ہم نے بعد میں اصول بنایا کہ کم سے کم چار ماہ تک بکری کا بچہ رکھنے کی خاتون پابند ہو گی۔ اسی جگہ پر ہم نے مرغیوں کا تجربہ بھی کیا اور ایک گاؤں میں مرغیاں دیں اور تربیت بھی دی جو بہت کامیاب رہا۔

ایک اور تجربہ ہم نے کیا۔ بکریوں کے سلسلے میں ہم ان دیہاتوں میں تسلسل کے ساتھ وزٹ کرتے تھے۔ ایک گاؤں جس کے قریب مارگلہ کا پہاڑ ہے جس کا نام شاہ اللہ دتہ ہے وہاں پر پہاڑ کے پانی سے کھیتوں میں ایک خاص قسم کی سبزی ہوتی ہے جس کا نام ہے جیرنڈا۔ یہ تر اور توری کے درمیان کی چیز ہے جس کو لوگ پکا کر کھاتے ہیں۔ لوگ کھیتوں سے نکال کر منڈی تک لے جاتے ہیں اور اردگرد کے دیہاتی وہ دوبارہ خرید کر لاتے ہیں جس سے نہ صرف یہ سبزی مہنگی ہو جاتی ہے بلکہ باسی بھی ہو جاتی ہے۔ اس گاؤں کے مرد بے کار تھے میں نے ان کی بے روزگاری کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا

کہ ہم پہاڑ میں پتھر کھودنے کا کام کرتے تھے۔مختلف اوقات میں پتھر ہمارے اوپر گرے اور کبھی ہاتھ اور کبھی پاؤں ٹوٹ گیا۔اب ہاتھ پاؤں بظاہر سلامت تو ہیں لیکن ہم وزن نہیں اٹھا سکتے۔تو میں نے ان کو تجویز دی کہ آپ اپنے گاؤں کی سبزی اردگرد کے دیہاتوں میں فروخت کریں۔انھوں نے کہا اس کے لیے سائیکل درکار ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ میں نے ٹرکل اَپ پروگرام سے پانچ لوگوں کو سائیکلیں لے کر دیں۔وہ سبزی کے بدلے گندم یا مکئی لیتے۔اس طرح وہ روزانہ ایک ڈیڑھ من غلہ بھی لے آتے تو اور کبھی کبھی سو یا پچاس روپے بھی۔ یہ گروپ بہت اچھے روزگار پر لگ گیا۔اس گاؤں میں پینے کے صاف پانی کا مسئلہ تھا۔پانی کا چشمہ پہاڑ میں تھا۔میں نے چند لوگوں کو گدھا اور گیلن لے کر دیے اور گاؤں والے ایک دو روپے فی گیلن پانی خرید لیتے تھے۔اس طرح اس بندے کو مزدوری مل گئی اور گاؤں والوں کو پینے کا صاف اور میٹھا پانی۔

سائیکلوں کا یہ تجربہ بعد میں میں نے ایک بڑے گروپ کے ساتھ کیا جو راولپنڈی اسلام آباد میں کباڑ کا کام کرتے تھے۔میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ کباڑیہ ان لوگوں کو سائیکلیں دیتا ہے اور ساتھ میں خریداری کے لیے پیسے بھی جسے وہ اپنی زبان میں ''موڑی'' کہتے ہیں۔

یہ کباڑ کا کام کرنے والے لوگ جو زیادہ تر نوجوان ہوتے ہیں،اسلام آباد کے مختلف سیکٹروں میں ردی اخبار،روٹیاں،وغیرہ خرید کر لاتے یں جب یہ واپس آتے ہیں تو اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ خریدا ہوا کباڑ صرف اس فرد کو دیں جس سے سائیکلیں اور رقم لی ہے اور وہ خریدتا ہے اپنی مرضی کے ریٹ سے جو مارکیٹ سے ایک یا دو روپے فی کلو کم ہوتا ہے۔اس طرح اگر روزانہ یہ نوجوان ڈیڑھ دو من مال ان کباڑیوں کو دیتے ہیں تو

سو، ڈیڑھ سو روپے کا خسارہ پاتے ہیں جو ماہانہ تین چار ہزار روپے بنتا ہے اور سائیکل کی قیمت اتنی نہیں ہے۔

میں نے ان لڑکوں کا گروپ بنایا۔اس کا نام تجویز کیا۔تپش یعنی ''تحریک پسماندگان شہر'' اس گروپ کو بیس یا تیس سائیکلیں خرید کر دیں اور یہ رقم اسی میں اکٹھی کر کے اور دوسرے بندے کو سائیکلیں لے کر دیں۔ یہ سائیکلیں جناب ذوالفقار گیلانی اور فیاض باقر صاحب نے ان نوجوانوں میں تقسیم کیں۔اس طرح یہ پروگرام بہت جاندار رہا ہے۔

ٹریکل اَپ پروگرام کی وزٹر نے اس پروگرام کو سراہا اور خاصی خوشی محسوس کی۔ ہم نے جو اس سے سیکھا وہ یہ ہے کہ چھوٹے کاروباروں میں منافع زیادہ ہے لیکن بنیادی سرمایا لوگوں کے پاس نہیں ہوتا۔اگر وہ فراہم کر دیا جائے اور کیش نہیں اشیا کی شکل میں دیا جائے تو لوگ اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔یعنی کم از کم منافع خور اور مڈل مین سے جان چھڑا سکتے ہیں۔صرف معمولی ہمت درکار ہوتی ہے۔

گھریلو کوڑے کی صفائی

یو این ڈی پی کے سمال گرانٹس پروگرام کے سربراہ سے ہمیں ایک جاننے والے نے ملوایا۔ لائف پروگرام کے تحت پورے پاکستان میں ماحولیات کو بہتر کرنے کے تجربات جاری تھے۔ راولپنڈی میں دو تین جگہ ایک سے دو لاکھ تک فنڈنگ کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے کی گئی۔ ہم نے بھی کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے درخواست دی۔ ہمیں بھی پراجیکٹ مل گیا۔

ہماری آبادی میں بہت زیادہ گند بھینسوں کی وجہ سے تھا لیکن گھریلو کوڑے کو بھی ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ پوری آبادی میں پندرہ کے قریب خاکروب تھے۔ جن کی ڈیوٹی صرف نالی اور گلی کو صاف کرنا تھا۔ گھروں کا کوڑا اٹھانا نہیں تھا۔ جس کے نتائج میں جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ خالی پلاٹ گند سے بھرے ہوئے تھے۔ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لوگ کوڑا ڈال دیتے۔ اس طرح پورا علاقہ گند سے بھرا ہوتا۔ گلیاں بھی تنگ تھیں جس میں کوڑے دان رکھنا ناممکن تھا۔

ہم نے ابتدائی طور پر بیس ایسی گلیوں کا انتخاب کیا جس میں بھینسیں کم تھیں۔ ہر گلی میں ایک میٹنگ کی اور اکثریت رائے سے ایک خاتون کو لین مینجر بنوایا۔ جس کے پاس ایک رجسٹر ہوتا جس میں نہ صرف خاکروب کی روزانہ کی حاضری ہوتی بلکہ گلی کے ہر گھر سے ماہانہ دس روپے وصولی کا اندراج ہوتا۔ ان نمائندہ خواتین کو تربیت دے دی گئی۔

اب اگلا مرحلہ تھا کہ ان کے لیے باقاعدہ خاکروب کا انتظام کیا جائے۔ ہم نے میونسپلٹی کے ایک فرد سے بات کی۔ انھوں نے باہم مشاورت سے ایک خاندان ہمارے حوالے کیا جو میڈیکل فٹ نہ ہونے کی وجہ سے سرکاری نوکری نہیں کر سکتے تھے۔ اس خاندان کے گھر میں فاقے ہو رہے تھے اور بیماری پر اٹھنے والی رقم بھی سود پر لی گئی تھی جس کا تقاضا سود خور ریگولر کرتا۔ یہ خاندان ہماری آبادی سے بہت دور رہتا تھا جس کی وجہ سے ان کے روز آنے جانے پر خاصا خرچ ہو سکتا تھا۔ ہم نے اپنے سکول کی چھت پر ان کو ایک کچا کمرہ بنا کر دیا جس سے یہ لوگ ہماری آبادی میں شفٹ ہو گئے۔

گلیوں میں کام کا آغاز کر دیا۔ ایک لکڑی کی ریڑھی ان کو بنا کر دے دی۔ لوگوں نے کوڑا دینا شروع کر دیا۔ یہ لوگ روزانہ مقرر کردہ گھروں سے کوڑا اٹھاتے اور گورنمنٹ کے کوڑے دان تک باقاعدگی سے پہنچاتے۔ پہلے ماہ دو سو گھروں کا کوڑا اٹھایا جس سے پندرہ سو روپے آمدن ہوئی۔ اس کے علاوہ روزانہ دس سے پندرہ روپے کا سوکھا کوڑا بھی فروخت ہوا۔ اس طرح کوڑے کا پروگرام چل پڑا اور آہستہ آہستہ نہ صرف کوڑا دینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ آمدن بھی بڑھنے لگی۔

گورنمنٹ کا کوڑا دان دور تھا چونکہ کوڑا زیادہ مقدار میں نکلنے لگا اس لیے خاکروبوں نے فرمائش کی کہ اگر قریبی میدان میں کوڑے دان بنایا جائے تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ ہم نے ان کی تجویز کو مان لیا اور مسلسل چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد میونسپلٹی سے کوڑا دان رکھوانے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہاں سے میونسپلٹی والے کوڑا نہیں اٹھاتے تھے جس سے کوڑا دان اٹھوانے میں چھ ماہ لگ گئے۔ پھر ہم نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے والی جگہ ٹھیک ہے۔ کوڑا اٹھانے والے اس خاندان نے اپنے بچوں کو بھی ساتھ لگا لیا جو

ایک وقت میں ہمارے سکول میں پڑھتے اور دوسرے وقت میں اپنے ماں باپ کی مدد کرتے۔ اب ان لوگوں کے گھر میں خوشحالی آ گئی ہے۔ قریبی سات سو گھر ان کو کوڑا دیتے ہیں اور آج تیرہ سال کے بعد بھی یہ پروگرام کامیابی سے چل رہا ہے۔ ان لوگوں نے گھر کے لیے پلاٹ خرید لیا ہے۔ بچوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔

ہماری اس کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے یو این ڈی پی نے جاپانی حکومت کی مدد سے ایک بڑے پروگرام کی Sweep کی بنیاد ڈالی جس کے مطابق پورے شہر میں خاکروبوں کو اس بات کی تحریک دی کہ وہ اپنی مدد آپ کے تحت گلیوں سے کوڑا ریگولر بنیادوں پر اٹھائیں۔ میونسپلٹی کو نئی گاڑیاں اور کوڑے دان دیے گئے۔ افسران کو تربیت دی گئی اور کسی حد تک شہر میں کوڑے کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ میری زندگی کا یہ بہت نمایاں تجربہ رہا جس کو آج تیرہ سال بعد میں نے دوبارہ نئے انداز سے کرنے کی کوشش کی جس کا تذکرہ میں ای گارڈ پراجیکٹ میں کروں گا۔

اس پروگرام کی کامیابی مثالی رہی اور اگر لوگوں کو سرگرم کیا جائے تو وہ اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں اور نہ صرف حل کرتے ہیں بلکہ مالی اور جانی تعاون بھی کرتے ہیں۔

قرضہ سکیم

ڈاکٹر اختر حمید خان نے مختلف اداروں کے ذریعے قرض مختلف طریقے سے غریب عوام تک پہنچایا۔ ہم نے ان کے اورنگی چیئرٹی ٹرسٹ والے ماڈل کو اپنایا کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار ہو وہ چھوٹے چھوٹے قرضے کے لیے درخواست دے جو ایک ہزار سے بیس ہزار تک ہوسکتا ہے۔ جس کے لیے دو شخصی ضمانتیں دی جائیں گی اور یہ رقم ایک یا ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بمعہ مارک اَپ واپس کرنا ہوگی۔

ابتداء میں ہم نے چالیس، پچاس لوگوں کو OCT سے قرض دلوایا۔ بعد میں ہمارے پاس ایک ڈونر سے اپنی رقم آ گئی جو اس سے مختلف اس لیے تھی کہ جن بچوں کو ہم سکول میں پڑھا رہے تھے۔ ان میں ایسے والدین تلاش کریں جن کی آمدن میں اضافہ ہو اور وہ بچوں کے سکول کی فیس آرام سے دے سکیں۔

ایک شخص جو راج مستری کا کام کر رہا تھا اس کے چار بچے ہمارے سکول میں زیر تعلیم تھے۔ وہ بڑی مشکل سے فیس دے سکتا تھا۔ جب ہم نے اس سے قرضہ پروگرام پر تبادلہ خیال کیا تو اس نے اپنا منصوبہ پیش کیا کہ میں راج مستری ہوں۔ اگر آپ لوگ مجھے پانچ ہزار روپے کا قرض دے دیں تو میں لکڑی کے پھٹے خرید لوں گا اور جہاں میں کام کروں گا وہاں پر کرایے پر لگا دوں گا اس طرح سو/ پچاس روپے روز کی آمدن ہوگی جس سے نہ صرف میں آپ کی قسط ادا کر سکوں گا بلکہ بچوں کی فیس بھی دے سکوں گا۔

اس طرح ایک شخص بے روزگار تھا۔ اس نے بتایا کہ میں پانچ ہزار روپے قرض سے ایک ریڑھی خرید سکوں گا اور روزانہ آلو/ پیاز منڈی سے لاسکوں گا جس سے میں تین سو، پانچ سو روپے روز کماؤں گا۔

یہ تو وہ مثالیں ہیں جنھوں نے قرض کو بہتر استعمال کیا لیکن کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جن کو ہم نے قرضہ دیا تو انھوں نے سرمایہ ڈبو دیا۔ رقم کو کاروبار کی جگہ کہیں اور لگا دیا۔ ایک شخص نے ہم سے قرض لیا تو اس نے اپنے بچوں کے لیے رنگین ٹی وی لے لیا۔ اس طرح دوسرے شخص نے کچن بنالیا، تیسرے شخص نے اپنی بیٹی کی شادی کر لی۔ ہم نے بعد میں OCT کی مدد سے دو کروڑ روپیہ قرض دیا۔ جس میں ایک ہزار سے زیادہ قرض دار تھے لیکن ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ پروگرام زیادہ کامیاب نہیں۔ بہت کم لوگ اس کو صحیح استعمال کرتے ہیں۔ لوگ مشکل سے قرض ختم کرتے ہیں اور آخری قسط جو کہ مارک اَپ والی ہوتی ہے وصول کرنے میں خاصی تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ البتہ رقم کی لین، دین چل رہی ہوتی ہے۔ یعنی آپ کی بنک سٹیٹمنٹ بن رہی ہوتی ہے۔ جس سے عام آدمی کو کم اور تنظیم کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ کمیونٹی میں تنظیم کو سود خوروں کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں عموماً قرض دار سے جھگڑے کا احتمال رہتا ہے جو سماجی تنظیموں کے لیے بہتر نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے نئے قرض کے طریقے نکالے ہیں جس میں سے ایک طریقہ اشیاء کی فروخت کا ہے لیکن اس سے غریب آدمی کو فائدہ کم اور اشیاء فروخت کرنے کا فروغ زیادہ ہوتا ہے۔ بہر حال قرض پروگرام وہ ٹیپ ریکارڈ ہے جس میں سے آپ تلاوت بھی سن سکتے ہیں اور گانا بھی۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہوا کہ قرضہ دینے کا موجودہ طریقہ تبدیل کرنا ہوگا اور کوئی ایسا طریقہ دریافت کرنا ہوگا جس سے عام آدمی کی حالت کو بہتر کیا جائے اور وہ تیز ترین مہنگائی کا مقابلہ کر سکے اور اپنی غربت کو دور کر سکے۔

ماحولیاتی آلودگی کا خاتمہ

جنوبی ایشیا بالخصوص پاکستان میں ماحولیاتی آلودگی کی ایک وجہ ٹو سٹروک انجن والے رکشا ہیں جن کی تعداد پاکستان میں اڑھائی لاکھ سے زیادہ ہے۔ چونکہ اس سے عام لوگ استفادہ حاصل کرتے ہیں اس لیے اس کو یک دم بند نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ بھارت کی سپریم کورٹ نے حکم دے دیا تھا کہ ایسی گاڑیوں کو ختم کیا جائے جو آلودگی کا باعث ہیں اور ٹو سٹروک رکشا پر پابندی لگادی۔ پاکستان میں ایسا کرنا مشکل تھا۔

میں نے اس پر ریسرچ کی تو معلوم ہوا کہ اگر رکشوں میں CNG یا LPG گیس کٹ لگادی جائے تو اس کی زہریلی گیسوں کے اخراج کو کم کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں یو این ڈی پی کے پروگرام سے رابطہ کیا جنھوں نے پرپوزل مانگی۔ ہم نے دو ملین روپیہ رکشوں والوں کو قرض دینے کے لیے مانگا جبکہ پانچ لاکھ روپے جاری اخراجات کے لیے۔

یو این ڈی پی نے ہماری یہ درخواست منظور کر لی۔ اب ہم نے اس سلسلے میں تحقیق کی کہ رکشا گیس کٹ کہاں اور کتنے کی دستیاب ہے۔ ترکی سے درآمد شدہ گیس کٹ آٹھ سے دس ہزار میں رکشے میں لگ سکتی تھی جبکہ CNG کے لیے بیس سے پچیس ہزار روپے درکار تھے جو اٹلی کی تھی۔ پاکستانی LPG گیس کٹ کی مالیت پانچ ہزار روپے تھی لیکن وہ زیادہ کامیاب نہیں تھی۔

ہم نے رکشوں والوں سے بات کرنے کے لیے ان کی یونین سے بات چیت کی۔ یونین والوں کو بریفنگ دی اور انھیں گیس کٹ کے فوائد بتائے کہ رکشے میں گیس کٹ لگانے سے نہ صرف ماحولیاتی آلودگی کم ہوگی بلکہ پٹرول اگر روز کا تین سو روپے کا استعمال ہوتا ہے تو گیس اتنا سفر سو روپے میں کرے گی۔ اس طرح ماہانہ چھ ہزار روپے کا منافع ہوجائے گا۔ یونین والوں کو ہماری بات سمجھ آ گئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم رکشوں والوں کو قائل کرتے ہیں اور آپ لوگوں کے لیے ایک پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ آپ ان کو گیس کٹ کے متعلق بتائیں۔

ہم منعقدہ تقریب میں چلے گئے۔ بیس سے پچیس رکشے والے اکٹھے تھے۔ ان کو گیس کٹ کی اہمیت بتائی۔ وہ لوگ راضی نہیں ہوئے۔ اکثریت کا کہنا تھا کہ رکشا کی رفتار کم ہوجائے گی اور اونچائی پر نہیں جا سکے گا۔ گیس کٹ کے مستری نہیں ہیں۔ گیس کہاں سے ملے گی۔

ان تمام سوالات کی اہمیت تھی۔ ہم نے ان سوالات کے حل تلاش کیے۔ تحقیق کی کہ شہر میں ایسی کتنی جگہیں ہیں جو اونچائی پر مشتمل ہیں تو معلوم ہوا کہ صرف ایک جگہ ہے۔ مختلف مستری خانوں میں گئے اور تحقیق کی کہ کون سا مستری گیس کٹ کے کام کو سمجھتا ہے۔ تحقیق سے ایک مستری ملا۔ اس طرح رکشوں والوں میں ایک رکشا ڈرائیور کو راضی کیا کہ وہ رکشا چھوڑ کر گیس کا کاروبار شروع کرے۔ جس پر وہ راضی ہوگیا۔ ہم نے دوبارہ رکشا والوں سے میٹنگ کی اور ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات دیے کہ شہر میں صرف ایک ایسا مقام ہے جو اونچائی پر ہے۔ فلاں جگہ پر مستری موجود ہے اور فلاں شخص وعدہ کرتا ہے کہ آپ کو گیس فراہم کرے گا۔ رکشا ڈرائیورز نے دوبارہ سوال اٹھایا کہ ہم

یک مشت اتنی رقم گیس کٹ پر خرچ نہیں کر سکتے جس پر ہم نے انھیں بتایا کہ آپ کو قرض ملے گا اور آپ لوگوں نے آسان اقساط میں واپس کرنا ہوگا۔

تیسری میٹنگ میں ایک پرانا بابا جس کے پاس پرانا رکشا تھا اس کو تجربے کے لیے تیار کیا گیا۔ پہلے تو وہ کہہ رہا تھا، جاؤ جاؤ میرا رکشا خراب نہ کرو۔ پھر یونین والوں نے سمجھایا کہ اگر تمھارا رکشا خراب ہوا تو ہم ٹھیک کر کے دیں گے یا دوسرا رکشا دیں گے۔ جس پر وہ راضی ہوگیا۔ ہم نے پہلی گیس کٹ اس کے رکشے میں لگائی اور تجرباتی طور پر چلانا شروع کیا۔ نتائج بہت اچھے آئے۔ بابا بہت خوش تھا کیونکہ پٹرول کے خرچ کم ہوگئے اور آمدن بڑھ گئی۔ ہم نے دوبارہ رکشوں والوں کا اجتماع منعقد کیا اور اس بابے کے ذریعے بات چیت کروائی۔ ایک نوجوان نے کہا کہ یہ بابا تو پرانا ہے۔ ہمیں تو مزہ نہیں آئے گا جب رکشا ٹرٹر نہیں کرے گا۔ بہرحال پانچ لوگ مزید تیار ہوگئے اور ہم نے اگلے دن پانچ لوگوں کو قرضہ جاری کیا اور پانچ رکشوں میں گیس کٹ لگائی۔

جب رکشوں کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی تو ہم نے ان رکشوں کے ارکان سے ایمشن ٹیسٹ کروانا شروع کیے۔ تین ٹیسٹ کروائے گئے۔ پہلا ٹیسٹ کٹ لگانے سے پہلے، دوسرا بعد میں اور تیسرا تین ماہ بعد۔ بڑے اچھے نتائج آنے لگے۔ البتہ LPG سے CNG کے نتائج زیادہ اچھے تھے لیکن CNG کٹ بہت مہنگی تھی اور دوسرا اس کا پریشر بہت زیادہ تھا۔ ہمیں ڈر تھا کوئی حادثہ نہ ہوجائے۔ جس سے ہماری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ CNG کٹ کے اخراجات بہت زیادہ تھے لیکن جاری اخراجات کم تھے۔ منافع زیادہ تھا لیکن ایک وجہ اس کی ناکامی کی یہ تھی کہ وزن زیادہ تھا۔ یعنی ہر وقت رکشے میں ایک سواری کا وزن رہتا۔

ہماری ساری توجہ LPG پر رہی اور دوسو رکشوں کو بیس لاکھ روپے کا قرضہ دیا۔ ہر رکشے والا پانچ سو روپے ماہانہ واپس کرتا اس طرح ہم ہر ماہ مزید دس لوگوں کو قرض جاری کر سکتے۔

کچھ پرائیویٹ لوگوں نے بھی اس پروگرام میں دلچسپی لینا شروع کی اور گیس کٹ آسان اقساط پر دینا شروع کی۔ اس طرح کچھ کاروباری حضرات نے مختلف جگہوں پر گیس کے لیے سینٹر قائم کیے۔ مستری آہستہ آہستہ سیکھ گئے۔ آہستہ آہستہ رکشوں میں گیس کٹ لگ گئی۔ اب ڈرائیور حضرات بھی مالک کو گیس کٹ والے رکشے کے تین سو اور پٹرول والے کے دوسو روپے دیہاڑی دیتے۔ مالکان نے مزید نقصان سے بچنے کے لیے فوراً اپنے رکشوں میں گیس کٹ لگوائی۔

حکومت کے لوگوں کو گیس سینٹر پر تحفظات تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ حادثے کا باعث ہوسکتا ہے۔ ایک بڑے سلنڈر سے چھوٹے سلنڈر بھرتے وقت حادثہ ہوسکتا ہے۔ آگ لگ سکتی ہے۔ مقامی پولیس فورس نے ان سینٹروں کو بند کرنا شروع کیا۔ رکشوں والوں نے احتجاج کیا۔ مری روڈ بلاک کر دیا۔ جس پر مذاکرات ہوئے اور یہ طے ہوا کہ پانچ کلو کے چھوٹے سلنڈر رکھے جائیں گے جو رکشوں والوں کو دیے جائیں گے۔ حکومت نے LPG پمپ متعارف کرانے کا وعدہ کیا ہے لیکن وہ ابھی تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

قصہ مختصر اب آہستہ آہستہ نہ صرف راولپنڈی شہر میں بلکہ تمام بڑے شہروں میں یہ پروگرام پھیل گیا ہے۔ اگرچہ کچھ بنکوں نے بھی ہم سے رابطہ کیا کہ وہ بھی اس پروگرام میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن مکمل ضمانت نہ ہونے کی وجہ سے پیچھے ہٹ گئے۔ البتہ حکومت

نے فور سٹروک رکشے درآمد کیے اور بنکوں کے ذریعے قسطوں پر دیے۔ اب جس دن گیس نہیں ہوتی رکشوں والے رکشا نہیں چلاتے۔ تسلسل اور ثابت قدمی سے نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

سیلاب میں کام

23۔ جولائی 2001 کوراولپنڈی کے نالہ لئی میں سیلاب آیا۔ یہ ایک چھوٹا سا نالہ ہے لیکن جب اسلام آباد کے پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو پانی کا رُخ راولپنڈی کی طرف ہوتا ہے اور بڑی تباہی لاتا ہے۔ عام طور پر کافی دن بارش ہوتو نقصان ہوتا ہے لیکن اس مرتبہ صبح چھ بجے بارش شروع ہوئی اور دن دس بجے تک رہی جس کے بعد نہ صرف نالہ لئی کے کنارے آبادمکین ڈوب گئے بلکہ بازاروں کے اندر بھی تین تین فٹ پانی آ گیا۔

لئی کے اردگرد مکانوں میں پانی داخل ہوگیا اور لوگوں کو سامان بچانے کا موقع نہ ملا۔ اس طرح بازاروں میں بھی لوگوں کی دوکانوں میں پانی داخل ہوگیا۔ بیسمنٹ بھر گئیں۔ کروڑوں روپے کا سامان بے کار ہوگیا۔ نالہ لئی کے کنارے لوگوں نے بھینسیں رکھی ہوئیں تھیں۔ زیادہ تر بہہ گئیں جو بعد میں لوگوں کی چھتوں سے ملیں۔ گزشتہ سو سال میں نالہ لئی کے اندر جتنا کوڑا لوگوں نے پھینکا تھا وہ سارا لوگوں کے گھروں میں واپس آ گیا۔ بہت لوگ مرگئے۔ مکان تباہ ہوگئے۔ مویشی مرگئے۔ ایک قیامت کا منظر تھا۔

ایسے حالات میں ہم لوگ خود پریشان تھے کہ کیا کریں اور کہاں سے شروع کریں۔ لوگوں کے گھر چونکہ گر گئے تھے لوگ کھلے آسمان تلے آ گئے۔ ہم نے پکے پکائے کھانے کا بندوبست کیا۔ ان لوگوں تک پہنچایا۔ اس دوران CRS (کیتھلوک ریلیف سروس) سے رابطہ کیا وہاں پر گل ولی خان نے ہماری رہنمائی کی۔ سب سے پہلے انھوں

نے ہمیں سو خاندانوں کے لیے ٹینٹ شیٹ دیئے جس کے ساتھ بانس بھی تھے۔ ہم نے کام کے لیے دس یونین کونسلوں کا انتخاب کیا۔ بلدیاتی انتخابات ہوگئے تھے اور ہر یونین کونسل میں اکیس منتخب نمائندے موجود تھے۔ ان میں سے ایک ایک دو دو نمائندے لیے اور ان کے ذریعے لوگوں تک ٹینٹ شیٹ پہنچائی۔ دوسرے مرحلے میں پانی کے لیے کین اور پانی صاف کرنے والی گولیاں (کلورین) دیں۔ جب ہم نے لوگوں کے گھروں کا دورہ کیا تو جس کا پورا گھر نہیں گرا تھا ان کی لٹرین ضرور گرگئی تھی کیونکہ یہ نالہ لئی کی طرف تھی یا مٹی سے بھر گئی تھی۔ ہم نے CRS کے تعاون سے سو، ایک سو بیس گھروں میں لیٹرینوں کی تعمیر کا آغاز کیا اور اس دوران پٹ لیٹرین متعارف کروائی جو کہ گھڑے کے اوپر بنائی جاتی ہے اور اس کا پانی زمین میں جذب ہوجاتا ہے۔ اس طرح لوگوں کے پاس نئی ٹیکنالوجی آ گئی جن لوگوں کے گھر بچ گئے تھے ان میں پانی آنے کی وجہ سے بو زیادہ تھی۔ لوگوں کو چونے اور بُرش دیئے تا کہ لوگ اپنے گھروں کو صاف کرسکیں۔

اگست تک یہ ریلیف جاری رہا۔ ہم روزا اپنے دفتر میں کونسلروں سے میٹنگ کرتے تھے اور حکمت عملی مرتب کر کے شہر میں مختلف جگہ پر منعقد تقریب میں شریک ہوتے اور اپنی تجاویز رکھتے۔ آئندہ سیلاب سے بچنے کا ہمارے ذہن میں ایک ہی حل تھا کہ اسلام اباد والے اپنے پانی کا بندوبست کریں۔ وہ نہ صرف عام دنوں میں گندہ پانی بہاتے ہیں بلکہ بارش کے پانی سے بھی راولپنڈی کے باسیوں کو متاثر کرتے ہیں۔ میں نے یہ بات ایک تقریب میں رکھی تو مہمان خصوصی پنڈی کے ناظم غصہ کر گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صاحب خود اسلام آبادی ہیں۔

چھٹیوں کے بعد بچوں کے سکول کھل گئے لیکن بچوں کے پاس نہ یونیفارم تھا اور

نہ ہی کتابیں بچی تھیں۔ ہم نے دوبارہ CRS کو درخواست کی، گل ولی کا اللہ بھلا کرے ہماری درخواست منظور ہوگئی اور پانچ سو بچوں کے لیے یونیفارم اور کتابیں مل گئیں جو مختلف تقاریب میں ہم نے لوگوں میں بانٹیں۔

اکتوبر میں سردی شروع ہوگئی لوگوں کے پاس بستر نہیں بچے تھے۔ ہم نے CRS کی مدد سے پانچ سو گھرانوں کے لیے بستر بنائے۔ اس کی تقسیم کا اس دفعہ ہم نے یہ طریقہ کار رکھا کہ ایک ٹوکن بنایا جس پر بستر کا جوڑا ملتا تھا۔ نالہ لئی کے کنارے میں نے خود ایک ایک گھر میں گئے اور سب کو ٹوکن دیا اور بتایا کہ فلاں جگہ پر تشریف لائیں آپ کو بستر مل جائے گا۔ اس سے نہ صرف ہمیں اطمینان ہوا بلکہ حق دار کو بستر مل گیا۔

لوگ جب ٹینٹ سے واپس گھروں کو چلے گئے تو گھر میں سفیدی ہوگئی۔ لیٹرین بن گئی، بچوں کے یونیفارم اور کتابیں مل گئیں۔ بستر میں سونے لگے تو ان کی الماریاں خالی تھیں جس میں مہمانوں کے لیے برتن ہوتے تھے لوگوں نے اپنے کونسلروں کے ذریعے ہمارے پاس یہ پیغام پہنچایا۔ ہم نے یہ پیغام CRS تک پہنچایا تو تین سو خاندانوں کے لیے پلاسٹک کے ڈنر سیٹ کی منظوری ہوئی جو ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا۔

ایمرجنسی کے دوران کام کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور مرحلہ وار ریلیف میں ، میں نے سیکھا اور عوامی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے ضرورت کی اشیاء ان تک پہنچائیں۔ یہ تجربات آگے چل کر مجھے مختلف جگہوں پر کام آئے۔ میں نے اس سے ایک چیز سیکھی کہ ایمرجنسی کے دوران اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا ہوتا ہے اور ٹیم ورک ضروری ہے۔

ٹیچر ریسورس سینٹر

ہمارے ہوم سکول، فارمل سکول اور نان فارمل سکولوں کو عالمی سطح کی تربیت دستیاب تھی جس میں ایک کنیڈین شہری ڈینیئل اور اُس کے خاندان نے حساب دانی جبکہ ABES کے ایڈون سیمسن صاحب نے بچوں کے لیے دوسالہ طریقہ تدریس ہمارے اساتذہ تک پہنچایا۔ لیکن ہمارے اردگرد دیگر پرائیویٹ سکول روائیتی طرز سے تعلیم دے رہے تھے۔ جس میں زیادہ تر ان آبادیوں کے غریب بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہم نے جدوجہد کر کے پچیس پرائیویٹ سکولوں کی تنظیم بنائی۔ ان سکولوں کے مالکان کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ ان کے صدر، سیکرٹری منتخب کروائے۔ پھر اپنے سکول میں ایک کمرہ مخصوص کیا جہاں پر اساتذہ کی تربیت کے لیے TRC یعنی ٹیچر ریسورس سینٹر بنایا۔ اس سینٹر کے قیام کے لیے ایشیا فاؤنڈیشن نے ابتدائی رقم دی۔ اتفاق کی بات دیکھیں کہ اس سینٹر کے افتتاح کے لیے امریکی سفیر آئی جس سے ہمارے سینٹر کی اہمیت بڑھ گئی۔

ہم نے ابتدا میں تمام سکولوں سے دو، دو، تین، تین ٹیچرز کا انتخاب کیا اور انھیں ABES سے ٹریننگ دلوائی جن میں سرٹیفکیٹ کی تقسیم کے لیے ضلع ناظم آئے۔ اساتذہ کو بچوں کو پڑھانے کے جدید طریقے سکھائے۔ اس طرح ان اساتذہ کے لیے مہینہ کی خصوصی تربیت کینیڈین ماہرین سے کروائی۔

ایک چیز جو ہم نے پرائیویٹ سکولوں سے سیکھی، وہ یہ ہے کہ یہاں اساتذہ بہت

جلدی سے تبدیل ہوتے ہیں۔ اگر وہ کسی دوسرے سکول میں چلی جائے تو اتنا نقصان نہیں ہوتا لیکن اگر چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے تو تربیت بے کار ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ ایسے اساتذہ کو تربیت دی جائے جو سکول سے زیادہ عرصے کے لیے منسلک ہوں۔ اس کے علاوہ ٹیچرز ریسورس سینٹر میں ایک تربیت یافتہ خاتون کو کوآرڈینیٹر تعینات کیا جائے جو ہفتے میں ایک دن نئے آنے والے اساتذہ کے لیے سیشن کر سکے۔ اس طرح وہ اساتذہ جو نئے ہوتے ہیں ان کی تربیت ہو جاتی ہے اور خلا کو پُر کر لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری یہ کوآرڈینیٹر ہفتے میں ایک چکر ہر سکول کا ضرور لگائیں جہاں پر دی گئی تربیت کا عملی مظاہرہ دیکھیں اور کسی کمزوری کی صورت میں نشاندہی کریں۔ جس کی درستگی کے لیے سکول مالکان سے میٹنگ کریں۔ اس طرح وہ اساتذہ جو جدید طریقہ تدریس سے ناواقف تھے وہ تربیت یافتہ ہو جاتے۔

اس تنظیم کی مدد سے ہم نے ایک کوشش اور بھی کی کہ تمام سکولوں کا نصاب ایک جیسا کر دیا جائے۔ ان کے امتحانی طریقہ کار کو یکساں کیا جائے لیکن اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

ایک مشترکہ لائبریری اور کمپیوٹر سینٹر بھی قائم کیا جس سے اساتذہ استفادہ حاصل کرتے تھے۔ بعد میں ان تمام سکولوں کو ایک انٹرنیشنل ادارے کے ساتھ جوڑ دیا جس میں امریکی ماہرین تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ہمارے ان گلی، محلے کے سکولوں کو تربیت فراہم کی بلکہ ان کو ہر کلاس روم کے لیے لائبریری اور میٹریل وغیرہ بھی دیا۔ ان سکولوں کے بچوں کی ماؤں کو بھی تربیت دی کہ وہ گھروں میں اپنے بچوں کے ساتھ کیسے کام کریں گے۔

صحت پروگرام

ہم نے اپنی تنظیم کے بورڈ مختلف جگہ پر لگائے تھے۔ ان بورڈوں کو فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن آف پاکستان کے پروگرام آفیسر انوار الحق تبسم نے پڑھا اور ہمارے پاس آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ باقی پروگرام چلا رہے ہیں۔ ہماری بھی ایک ڈسپنسری چلائیں۔ ہم نے کہا بسم اللہ! انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کو ایک LHV دیں گے، ڈسپنسری کا سامان اور ماہانہ اخراجات آپ کو صرف ایک کمرہ دینا ہوگا۔ ہم نے اپنے پرائمری سکول میں ایک کمرہ دے دیا۔ اس طرح ہماری ڈسپنسری چل پڑی۔ اس ڈسپنسری میں عام دوائیاں کم اور منصوبہ بندی کی دوائی زیادہ دستیاب تھی۔ LHV خواتین کی رہنمائی کرتی۔ انھیں مختلف ٹیکے اور گولیاں دیتی اور جن عورتوں کی فیملی مکمل ہوگئی تھی انھیں آپریشن کا مشورہ دیتی۔ ابتداء میں لوگ بہت کم راضی ہوتے لیکن بعد میں جب خاندان کی ایک خاتون اس مرحلے سے کامیابی سے گزرتی تو باقی عورتیں بھی ایک ایک کر کے آپریشن کے لیے رضامند ہو جاتیں لیکن زیادہ تر وہ خواتین ہوتیں جو سات سات بچے پیدا کر چکی تھیں۔ البتہ ہم نے درجن ہونے سے انھیں بچا لیا تھا۔

FPAP کی ڈسپنسری کے بعد نیشنل ٹرسٹ فار پاپولیشن ویلفیئر نے بھی ہمیں ایک ڈسپنسری دی۔ اس پروگرام میں یہ لوگ گرانٹ دیتے تھے۔ باقی تمام انتظامات خود کرنے پڑتے۔ ہم نے دوسری آبادی میں ایک کمرہ اپنے سکول میں ڈسپنسری کے لیے مخصوص کر دیا۔ نیا فرنیچر اور اشیاء، دوائیاں خریدیں LHV اور دو سوشل موبلائزر تعینات کیں جو گھر گھر جاتیں اور خواتین کو آمادہ کرتیں کہ وہ منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل

کریں۔کنڈوم سے مرد حضرات خوش نہ ہوتے۔ گولیوں سے عورتیں ناراض تھیں کیونکہ روٹی کی طرح کھانی پڑتیں۔ ٹیکہ پر زور زیادہ ہوتا لیکن بعض خواتین کو یہ طریقہ راس نہ آتا۔جس کے لیے ان کو پٹی وغیرہ کرنی پڑتی لیکن زور آزمائی میں اکثر بلیڈنگ ہوجاتی اور جس کو ٹھیک کرنے کے لیے ہماری LHV مصروف رہتیں۔

ہماری ڈسپنسریوں کی کامیابی کی ایک وجہ سکول کے بچے اور دستکاری سینٹر کی لڑکیاں تھیں جن کی مائیں اکثر و بیشتر ان کو چھوڑنے آتیں تو ڈسپنسری میں موجود LHV سے علاج معالجہ بھی کرا لیتیں۔ البتہ مقامی کمیونٹی میں موجود عطائی ڈاکٹر ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہتے۔ یہ غیر شرعی کام کر رہے ہیں۔ان کی ڈسپنسری بند ہونی چاہیے کیونکہ ہم منصوبہ بندی کے ساتھ عام دوائیاں بھی دیتے جس سے ان کے اوپر اثر پڑتا اور وہ ہمارے مخالف بیان بازی کرتے۔لیکن چونکہ عوام میں شعور آ گیا ہے اس لیے بہت کم لوگ ان کی بات پر توجہ دیتے۔

غیر سرکاری اداروں کا قیام

میں نے سب سے پہلے جس ادارے میں کام کیا وہ ایک لیڈی کونسلر کا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کس ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ تھا اور رجسٹرڈ تھا بھی یا نہیں۔لیکن میں اس کا علاقائی سیکرٹری مقرر ہوا۔ پھر علاقائی سرپرست کے ساتھ اختلاف پر میں سوشل ویلفیئر کے آفس کے چکر کاٹنے لگا تاکہ اپنا ادارہ رجسٹرڈ کرواسکوں۔سوشل ویلفیئر کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر فرحت افزا بہت اچھی خاتون تھی اور اس نے مجھ سے اتا پتا پوچھا۔اس نے سوشل ویلفیئر افیسر محبوب عالم کو بلایا۔ باہم مشورے کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے علاقے میں ایک رجسٹرڈ شدہ تنظیم انجمن فلاح و بہبود کے نام سے کام کر رہی ہے۔ وہ غیر فعال ہے۔ اس کو حرکت میں لے آئیں۔ صرف آپ پندرہ لوگوں کے نام دے دیں۔یعنی سات عہدے دار اور آٹھ ممبران تو میں ایک خط جاری کردوں گا جس کے بعد آپ اس ادارے کے نام پر تمام معاملات چلاسکیں گے۔ مجھے تجویز پسند آئی۔ میں نے علاقے کے لوگوں کی ایک میٹنگ بلائی اور پندرہ اہم افراد کی فہرست بنا کر اگلے دن سوشل ویلفیئر آفیسر کے پاس لے گیا۔انھوں نے ری آرگنائز کرنے کا ایک خط جاری کر دیا۔ مجھے منشور کی ایک کاپی بھی نکال کر دی۔ میں نے علاقے میں تحقیق کر کے اس کے سابقہ صدر سے رجسٹریشن کی کاپی بھی حاصل کر لی اور اس طرح جو ادارہ 1974 میں رجسٹرڈ ہوا تھا۔ ہم نے 1990ء میں اس کو ری آرگنائز کر دیا اور کام شروع کر دیا۔ ادارے کا اکاؤنٹ بنک میں کھولا۔ ابتدا میں ہمیں ڈونر وغیرہ کے بارے میں علم نہیں تھا جو بعد میں

پتہ چلا اور دس سے زیادہ مختلف ڈونر نے لاکھوں روپے دیئے۔ تعلیم، صحت، ماحولیات، قرضہ جات کے بے شمار پراجیکٹ چلائے جو علاقے کی بہتری کے لیے تھے۔ ٹھیک دس سال بعد 2000ء میں ہمارے آپس میں اختلاف ہوگئے۔ شگفتہ نام کی ایک خاتون جو ڈائریکٹر تھی، اپنے اسسٹنٹ ڈائریکٹر شاہ صاحب کے ذریعے انہوں نے ایک خط لکھا جس کے تحت ہم عہدے دار نہیں رہے اور یہ ادارہ ختم ہوگیا۔ آج صرف یہ ادارہ کاغذوں میں باقی ہے۔

میں نے 2000ء میں دو ادارے ٹرسٹ ایکٹ 1882ء کے تحت رجسٹرڈ کرائے۔ ایک الفلاح ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن اور دوسرا ڈاکٹر اختر حمید خان میموریل ٹرسٹ۔ ان کی رجسٹریشن رجسٹرار کے پاس ہوئی ہے۔ جہاں پر عام مکانات کی رجسٹری بھی ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے قوائد وضوابط پانچ سو روپے کے اسٹامپ پر قواعد لکھ کر مع اپنے بورڈ ممبر کے پیش ہونا پڑتا ہے۔ اس پہ رجسٹرار مہر لگا کردے دیتا ہے اور ادارہ رجسٹرڈ ہوجاتا ہے۔

الفلاح کے تحت ہم نے کریڈٹ پروگرام شروع کیے تھے جبکہ ڈاکٹر اختر حمید خان میموریل ٹرسٹ کے تحت سینی ٹیشن اور سالڈ ویسٹ کا پروگرام شروع کیا ہے۔ یہ دونوں ادارے اس وقت فعال ہیں اور اپنا اپنا کام کررہے ہیں۔ ان دونوں اداروں کی رجسٹریشن کو دس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ ان کے بورڈوں میں پانچ پانچ افراد ہیں۔

میں نے دو ادارے 1860ء کے قانون کے تحت بھی رجسٹرڈ کروائے ہیں۔ ایک کا نام ACD ایکشن فار کمیونٹی ڈویلپمنٹ رکھا گیا ہے۔ یہ ادارہ غالباً 1997-98ء میں اسلام آباد سے رجسٹرڈ کروایا تھا۔ اس ادارے کے تحت ہم نے اسلام آباد کے دیہی

علاقے میں کچی بستیوں کے افراد کے لیے مکانات کا بندوبست کرنا تھا جس کی غرض سے کچھ زمین بھی خریدی اگرچہ اس زمین کی خریداری کی رقم تسنیم احمد صدیقی صاحب نے سائبان سے دی اور اب تک چونکہ اس زمین پر NOC سی ڈی اے کی طرف سے نہیں ملا لہٰذا یہ ادارہ غیر فعال ہے۔

ایک اور ادارہ جو اسی قانون کے تحت ہم نے پچھلے سال رجسٹرڈ کروایا۔ اس کا نام ہے URC یعنی اربن ریسورس سینٹر۔ اس نام کا ایک ادارہ کراچی میں بھی کام کررہا ہے جس کے مقاصد یہ ہیں کہ شہریوں کے روزانہ کے عام مسائل کو اُجاگر کرنا۔ ہم بھی راولپنڈی/اسلام آباد کے شہریوں کے مسائل اُجاگر کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

مندرجہ بالا تمام ادارے منافع کے لیے کام نہ کرنے والے ادارے ہیں۔ منافع کے لیے ایک فرم کی رجسٹریشن کی ہے جس کا نام e-guard رکھا گیا ہے۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد شہری آبادیوں میں موجود کوڑے کو ٹھکانے لگانا ہے اور یہ سروس عوام کے براہِ راست ادائیگی یا ٹیکس سے منہا کی جائے گی۔ اس میں اب تک کامیابی یہ ہوئی ہے کہ کوئی دو ہزار گھروں سے کوڑا اکٹھا کرکے ٹھکانے لگایا جارہا ہے جس کے بدلے عوام براہِ راست سو روپے گھر دیتے ہیں جو کہ دو لاکھ روپے ماہانہ بنتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام رقم اس وقت تک تنخواہ کے اخراجات میں چلی جاتی ہے لیکن مستقبل قریب میں امکان ہے کہ منافع بھی شروع ہوجائے گا اور سرکار بھی رقم دینا شروع کردے گی۔ اس پراجیکٹ کے تحت ایک ہریالی سینٹر بھی بنایا گیا ہے جس میں سبز کوڑے سے کھاد بنائی جائے گی اور فروخت ہوگی۔

ایک اور ادارہ جو ابھی تک باقاعدہ رجسٹرڈ تو نہیں ہے۔ اس کا نام ہے

''ضامن کدہ'' اس کا مقصد غریب کسانوں کو تربیت دینا ہے۔ اس غرض سے کچھ زمین بھی خرید لی ہے۔ مستقبل میں شاید یہ ادارہ ایک ٹریننگ سینٹر بن سکے اور زراعت میں کوئی کردار ادا کر سکے۔

امدادی اداروں سے امداد لینا

جب ہم نے اپنا ادارہ شروع کیا تھا تو ہمیں معلوم نہ تھا کہ ان اداروں کے لیے کہیں سے امداد بھی ملتی ہے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ بے شمار ایسے ادارے موجود ہیں جو سماجی کاموں کے لیے امداد فراہم کرتے ہیں۔ اب سب سے بڑا مسئلہ ان کے پتے حاصل کرنا تھا۔ ہم نے مختلف اداروں، اخباروں اور دوست احباب سے ان اداروں کے ایڈریس معلوم کیے اور ان کو خطوط لکھنا شروع کیے۔ ہم نے اردو میں ہاتھ سے لکھے ہوئے چند صفحات اپنی کارکردگی کے بنائے اور جو بھی ہمیں ایڈریس ملتا اس پر کارکردگی کی کاپی ارسال کر دیتے۔ اکثر ہمارے پاس ٹکٹ خریدنے کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ ہم آنے والے خطوں پر نظر رکھتے اور ان پر بلا مہر لگے ہوئے ٹکٹ دوبارہ استعمال کر لیتے۔ ہمیں NGO کی ڈونر ڈائریکٹری بھی مل گئی جس میں بے شمار ایڈریس ملے۔ جن سے ہم نے رابطہ کیا۔

ہمیں پہلی فنڈنگ دو ہزار روپے میونسپل کارپوریشن سے اپنے صدر غلام محمد ناز کے توسط سے ہوئی۔ اس کے بعد DAPRC سے پانچ ہزار روپے کی فنڈنگ ملی۔ انھوں نے اخبار کے ذریعے پراجیکٹ مانگے تھے۔ پھر TVO کے لیے اسلم اظہر صاحب کے بیٹے اسامہ اظہر نے پرپوزل بنا کر دی اور وہاں سے ایک لاکھ 38 ہزار روپے کی امداد ملی۔ جس سے ہمیں پرپوزل بنانے کا طریقہ بھی آ گیا۔ ایک خط کے ذریعے CRS نے دو اڑھائی لاکھ کی خوراک امداد میں دی۔ پھر NZF نے 38 ہزار روپے اور پھر ایک لاکھ روپے کی امداد دی۔

یو این ڈی پی نے نہ صرف کراچی وزٹ کے لیے امداد فراہم کی بلکہ کوڑے کی صفائی کا نظام قائم کرنے کے لیے ویسٹ کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے دیے۔ پھر کراچی وزٹ سے OPP نے واٹرایڈ کی فنڈنگ کا رُخ ہماری طرف کر دیا اور شروع میں پچاس ہزار دیا اور آہستہ آہستہ بڑھا دیا۔

ان تمام اداروں سے ملنے والی امداد کے دوران ہم نے اپنی استطاعت کو بہتر کیا۔ انگریزی اور کمپیوٹر پر کام کرنے والے لوگ رکھے۔ فینسی رپورٹیں بنائیں۔ جس سے ڈونر خوش ہوتا ہے۔ ایک سو فیصد گھروں کا سروے بھی ترتیب دیا جس سے نہ صرف ڈونر کو بلکہ ڈاکٹر اختر حمید خان کو بھی متاثر کیا۔ جس میں ہمارے پاس تمام گھروں کی ہر قسم کی معلومات تھیں۔ ہم مختلف ٹریننگ ورکشاپوں اور سیمیناروں میں بھی امداد دینے والے اداروں کے نمائندوں پر نظر رکھتے اور اتہ پتہ لے کر ان کے دفتر اگلے دن پہنچ جاتے۔ انھیں اپنا منصوبہ پیش کرتے اور اپنے علاقے کی دعوت دیتے۔ دورے کے دوران انھیں گندی گلیاں دکھاتے اور اپنی غربت کا رونا روتے۔ ہمیں فیاض باقر نے سکھا دیا کہ ہر جگہ مانگو، ہر کسی سے مانگو، سب کچھ مانگو، ہر وقت مانگو، اس عالمی اصول پر ہم نے بھرپور عمل کیا اور پندرہ سے زیادہ اداروں سے امداد حاصل کی۔ ہر دوسرے دن گورے اور گوریاں ہمارے دفتر میں ہوتیں اور ہم انھیں کسی گلی کا دورہ کروا رہے ہوتے۔

ڈونر کے آنے سے جہاں ہمیں فائدے ہوئے وہاں کچھ نقصانات بھی ہوئے۔ ہماری پائیداری متاثر ہوئی۔ آپس میں شک شبہ بڑھ گیا۔ کمیونٹی کا اعتماد کم ہوا۔ ڈائریکشن تبدیل ہوتی رہی۔ ایک بات تھی امداد بڑی ایمانداری سے ملتی۔ آج پندرہ سال بعد زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح کرپٹ عناصر اب امدادی اداروں میں گھس گئے ہیں اور اب شاید ہی اداروں میں ہاتھ سے لکھے ہوئے خط پر کوئی ڈونر آپ کو امداد دے۔

غریبوں کے لیے بستی

غریبوں کے لیے بستی بنانے کی خواہش مدت سے تھی اور اس خواہش میں اس وقت اضافہ ہوا جب حیدرآباد میں تسنیم صاحب کی بنائی ہوئی ''خدا کی بستی'' کا مطالعہ کیا۔ میں راولپنڈی/اسلام آباد میں خدا کی بستی کے ماڈل کو اپنانا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے آج تک کامیاب نہ ہو سکا۔

اسلام آباد کے قیام کے بعد یہاں پر امیروں کے لیے آبادیاں بنائی گئی ہیں لیکن غریبوں کے لیے کوئی بستی نہیں ہے جس سے اسلام آباد میں چالیس سے زیادہ کچی آبادیوں نے جنم لیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ زمین جو سی ڈی اے نے خرید لی تھی لیکن ان کا قبضہ ابھی تک اصل مالکان کے پاس ہے۔ وہ بھی کچی آبادی کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ اس طرح کی ایک آبادی راول ڈیم کے قریب سنبل کورک کے نام کی تھی جس کو سی ڈی اے نے خالی کروا لیا اور یہاں کے لوگ بے گھر ہو گئے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے ان کے لیے کہیں بستی بنانے کا سوچا جس میں عاصم اختر، بشیر بٹر اور محترمہ نسرین اظہر پیش پیش تھے۔ میں نے اس آبادی کے ایک باشندے راجہ اسرار کے ہمراہ کراچی میں خدا کی بستی کا دورہ کیا اور وہاں کے طریقہ کار کو سمجھا۔ واپس آ کر ہم نے بستی کے لیے جگہ تلاش کی اور راول ڈیم اسلام آباد کے قریب کُری شہر میں ڈیڑھ سو کنال زمین خریدی جس کی رقم تسنیم احمد صدیقی کے ادارے سائبان نے ادا کی۔ ہم نے اُس زمین کا سروے کیا اور نقشہ تیار کروایا۔ تسنیم صاحب یہ نقشہ پاس کروانے کیلیے سی ڈی اے کے پاس لے گئے۔ آج

دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ سی ڈی اے نے یہاں پر بستی بنانے کی اجازت نہیں دی۔ تسنیم صاحب نے تین وزیر اعظموں کو بریفنگ دی لیکن سی ڈی اے کی طرف سے NOC نہیں مل سکا۔ اگرچہ اس دوران عمر اصغر خان کے ذریعے پرویز مشرف سے کچی آبادی کی پالیسی منظور کروائی گئی اور ہم نے یہ دلائل دیئے کہ غریبوں کے بغیر اسلام آباد ایک دن نہیں چل سکے گا کیونکہ مالی، ڈرائیور، خاکروب، چوکیدار نہیں ہوں گے تو سب کچھ بند ہو جائے گا۔ ہماری بات اس وقت کی حکومت کو سمجھ آئی۔ کچی آبادی پالیسی کا اعلان کر دیا گیا لیکن اس کے باوجود ہمیں خدا کی بستی بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اس وقت میری سوچ کچھ اس طرح بنی ہے کہ پچاس بے گھر لوگوں کا ایک گروپ منظم کرو جو دو ہزار روپے ماہانہ دیں۔ اس طرح ایک لاکھ روپے میں ہر ماہ ایک خاندان کو پلاٹ دلواؤں گا اور وہ خاندان اس زمین پر اپنا گھر بنائے۔

بے شمار خواب ہیں لیکن غریبوں کی بستی کا یہ خواب میری بڑی خواہش ہے۔ اگر زندگی رہی تو غریبوں کے لیے ایک بستی ضرور بناؤں گا۔

ای گارڈ

یہ بالکل نیا تجربہ تو نہیں تھا کیونکہ اس سے قبل 1997-98ء میں اس طرح کا ایک تجربہ کیا جا چکا تھا۔ لیکن اس کا زیادہ مزہ نہیں آیا تھا۔ موجودہ کام بہتر انداز میں شروع کیا۔

ہم لوگ گزشتہ دس، پندرہ برس سے اپنی مدد آپ کے تحت سیوریج کا پروگرام چلا رہے تھے۔ ایک تو اس کی رفتار آہستہ تھی۔ دوسرا جہاں پر سیوریج لائن ڈل جاتی وہاں گلیوں میں کوڑا نظر آنا شروع ہو جاتا۔ اب کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے ایک مستقل پروگرام کی ضرورت تھی۔ ہم جہاں پر کام کر رہے تھے وہ بظاہر تو کنٹونمنٹ کا علاقہ تھا لیکن وہاں کے حالات بہت خراب تھے۔ کوئی خاکروب نہیں تھا۔ صفائی کا نظام بہت ناقص تھا۔ چند گلیوں میں لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت سیوریج لائن تو ڈال لی لیکن کوڑے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔

ہم نے اپنے پرانے تجربے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک سوشل آرگنائزر قیصر عباس کی مدد سے گلیوں میں کمیٹیاں بنوائیں۔ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کوڑا اٹھانے کے لیے سو روپے فی گھر دیں گے۔ ہم نے ماضی کے تجربے کی طرح میاں بیوی خاکروب تلاش کیے اور یہاں پر لگا دیئے۔

پہلے مہینے، ڈیڑھ سو گھروں نے کوڑا دیا اور 130 کے قریب گھروں نے رقم ادا

کی۔ جو تیرہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ہمیں بہت حوصلہ ملا کہ یک دم اتنی رقم اکھٹی ہوگئی ہے اور دو تین ماہ میں یہ رقم 23 ہزار تک پہنچ گئی جو مزید خوبصورت نتائج تھے۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ اتنی غریب کمیونٹی اتنے آرام سے یہ رقم دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر گھر سے کم سے کم ایک روپے کا ایسا میٹریل نکلتا جو خاکروب اپنے لیے براہ راست فروخت کر دیتے۔ یعنی اگر وہ دوسو گھروں سے روز کا کوڑا اٹھا رہے ہیں تو دوسو روپے کا کباڑ (لوہا، تانبہ، شیشہ، پلاسٹک، کاغذ) فروخت کرتے۔

ابتدا میں ہم نے اس کام کے لیے چنگ چی ڈیزائن کی تھی لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔ اگرچہ خاکروبوں کے اس جوڑے نے اپنے لیے الگ چنگ چی لے لی ہے اور وہاں پر کام کر رہے ہیں۔ ہم نے باقی لوگوں کے لیے ریڑھی ڈیزائن کی جس کے تین پہیے ہوتے ہیں اور عام طور پر ریت والی چھلی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

خشک کوڑا تو فروخت ہوجاتا ہے لیکن گیلے کوڑے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ جس کے لیے ہم نے قریب ایک جگہ بنائی جس کو ہریالی سینٹر کا نام دیا۔ وہاں پر گیلے کوڑے کو ایک ہفتے کے لیے اکٹھا کیا جاتا ہے بعد میں وہ دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور وہاں پر مزید تازہ گیلا کوڑا ڈالا جاتا ہے۔ یہ عمل آٹھ ہفتے تک رہتا ہے۔ جبکہ بعد میں یہ قدرتی کھاد میں تبدیل ہوجاتا ہے جو پودوں کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ اس کے ہم ایک ایک کلو کے پیکٹ بناتے ہیں اور یہ بیس روپے کا فروخت ہوتا ہے۔ اگرچہ اس پر اتنی مزدوری لگ جاتی ہے لیکن بہر حال گند کو کم کرنے اور ٹھکانے لگانے کا اس سے بہتر کوئی حل نہیں۔

ہمارے اس کام کا پھیلاؤ آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ ہم نے یہ کام لوگوں کے حوالے کر دیا ہے۔ ہمارے پاس جو لوگ ابتدا میں بطور سوشل آرگنائزر (قیصر عباس،

بخشاد، بلاول خان اور تنویر مسیح) کام کرتے رہے تھے اب وہ اپنی مدد آپ کے تحت اس پروگرام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

سوشل آرگنائزر قیصر عباس کے پاس اس وقت تین سو کے لگ بھگ گھر ہیں جن سے تیس ہزار ماہانہ آمدنی ہوتی ہے جبکہ اس کے پاس ایک خاکروب ہے جس کو وہ دس ہزار روپے ماہانہ دیتا ہے اور اتنے کا ہی کباڑ بھی وہ فروخت کر لیتا ہے۔ یعنی یہ دو لوگ اس پروگرام سے ماہانہ پچاس ہزار روپے کما رہے ہیں۔

بخشاد جو کہ ایک بیوہ خاتون ہیں وہ سو گھروں کو سروس دے رہی ہیں جس کے پاس ایک خاکروب کام کر رہا ہے۔ یہ دونوں لوگ چھ چھ ہزار کما لیتے ہیں۔ بخشاد کچھ گھروں سے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ لے رہی ہے۔

اس طرح بلاول خان جو میٹرک پاس نوجوان ہے، وہ چار سو گھروں کو سروس دے رہا ہے اور اُس کے پاس چار لوگ ہیں جن کو وہ چھ چھ ہزار روپے تنخواہ دیتا ہے۔

یعنی اس وقت ایک ہزار سے زیادہ گھروں کو یہ سروس مل رہی ہے۔ ایک لاکھ سے زیادہ ماہانہ رقم اکٹھی ہو رہی ہے۔ تیس ہزار کے قریب کباڑ فروخت ہو رہا ہے۔ ہم نے ہریالی سینٹر میں ایک کباڑیہ بھی بٹھا دیا ہے جو خاکروبوں سے روز کا مال خرید رہا ہے۔ اس طرح کوئی پندرہ کے قریب لوگ اس پروگرام سے براہ راست روزگار حاصل کر رہے ہیں۔

ہم اس پروگرام میں مزید نئے تجربات کا سوچ رہے ہیں کہ پوری یونین کونسل کو یکجا کر کے سو روپے ماہانہ پہ سیوریج بھی فراہم کیا جائے۔

ایک اور بات جو آپ لوگوں کے علم میں لانا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ پہلے جن پانچ سو گھروں میں ہم نے کام کیا، وہاں پر ہم صرف ان گھروں کو سروس دیتے تھے جو رقم ادا کرتے تھے۔ لیکن جو لوگ باقی رہے جاتے وہ گلی میں کوڑا اپھینکتے۔ جس سے صفائی نظر نہیں آتی تھی۔ اگلے پانچ سو گھروں میں ہم نے تمام گھروں سے کوڑا اکٹھا کرنا شروع کیا اور گلی نالی میں بھی صفائی رکھی جس کے اثرات زیادہ بہتر ہیں۔

اس پروگرام کو ہم باقاعدہ مہم کی شکل دینا چاہتے ہیں جو گھر گھر میں سروس دے سکے اور کھاد بھی تیار کر سکے جو بیگ میں فروخت کی جا سکے۔

ایک اور تجربہ بھی کر رہے ہیں کہ مختلف محلوں میں محلّہ صفائی کمیٹیاں بنا کر یہ ذمہ داری ان کو بھی سونپ رہے ہیں تاکہ اجتماعی طور پر بھی لوگ اس مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھیں۔ مختلف یونیورسٹیوں کے طلبا اور طالبات، چیمبر آف کامرس اور تاجروں کی تنظیموں کو بھی شامل کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے علاوہ سکولوں کے بچوں سے تصاویری مقابلہ بھی کروا رہے ہیں تاکہ وہ بھی کوڑا کو ٹھکانے لگانے کے لیے جدوجہد میں شامل ہو سکیں۔

نوکری کا تجربہ

مہناز اکبر عزیز نے جب ایشیاء فاؤنڈیشن میں کام شروع کیا تو میرے پرائمری سکول کا وزٹ کیا۔ پھر ہم مختلف پروگراموں میں ملتے رہے۔ ڈاکٹر اختر حمید خان کے پاس کراچی میں ہم بھی تسلسل سے جاتے وہ بھی وزٹ کرتیں۔ کبھی کبھار وہاں ملاقات ہو جاتی۔

2000ء کے اوائل میں مہناز کی شادی دانیال عزیز سے ہوگئی۔ مجھے شادی پر نہیں بلایا۔ میں ایک دن اس کے دفتر گیا اور مہناز سے گلہ کیا کہ ہمیں آپ نے شادی پر نہیں بلایا۔ انھوں نے کہا تم نے کھانا کھانا ہے۔ ابھی چلو۔ وہ مجھے اپنی پرپل کلر ہنڈا سوک کار میں فرنٹ سیٹ میں ساتھ بٹھا کر گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے کچن کوزین پر لے گئی وہاں پر ایک ریک برگر آڈر کیا اور ساتھ کولڈ ڈرنک ہم نے درختوں کے کٹے ہوئے بنچوں پر بیٹھ کر مزے سے کھایا۔ اس دوران مہناز نے مجھے بتایا کہ حمید میں نوکری سے تنگ آ گئی ہوں اور مجھے اپنی NGO بنانا ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے این جی او بنانے کا طریقہ بتاؤ۔ NGO کیسے رجسٹرڈ ہوتی ہے۔

میں نے کہا آپ صرف پانچ بورڈ ممبر پورے کریں۔ رجسٹریشن میں کرادوں گا۔ مہناز نے کہا کہ ایک میں اور ایک تم ہو جاؤ گے۔ ایک کراچی سے ریاض صاحب کا نام ڈال دیں گے۔ ایک میں نے جاوید جبار سے بات کی ہے۔ پانچواں بندہ تلاش کر لیں

گے جس کے لیے میں نے تجویز دی کہ کسی خاتون کا نام ٹھیک رہے گا۔ میں نے کہا مزید سوچ لیں۔ ہم نے اپنا اپنا برگر ختم کر لیا تھا۔ میں نے اجازت مانگی اور اپنے موٹر سائیکل پر گھر آ گیا۔

کچھ دن بعد مہناز نے مجھے دوبارہ بلایا۔ رجسٹریشن پر دوبارہ بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا کہ شناختی کارڈ کی کاپیاں منگوائیں۔ مہناز نے کہا ٹھیک ہے لیکن اس وقت تم ایسا کرو کہ میں تمھیں کچھ فنڈنگ کرنا چاہتی ہوں۔ تم ایک پروپوزل بنا کر دو۔ میں نے ٹیچر ریسورس سینٹر TRC پر ایک پروپوزل بنا کر دے دی۔ مہناز نے ایشیاء فاؤنڈیشن سے فنڈنگ کرا دی۔ ہم نے راولپنڈی میں TRC بنایا جس کے افتتاح کے لیے مہناز امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین کو لائیں۔ جس سے ہماری تو علاقے میں بڑی مشہوری ہوگئی۔ مہناز کی بھی نہ صرف ایشیا فاؤنڈیشن بلکہ USAID اور امریکی سفارت خانے میں بڑی دھوم ہوگئی۔ اس دوران امریکہ سے USAID کا ایک وفد آیا۔ مہناز ان کو لے کر میرے پاس ڈھوک حسو آ گئی۔ میں نے انھیں نہ صرف TRC وزٹ کرایا بلکہ سرکاری سکول بھی دکھائے۔ کچھ دن بعد امریکہ سے ایک اور وفد وزٹ پر آیا۔ مہناز تھک چکی تھی۔ اُس نے مجھے فون کیا۔ حمید اللہ دو خواتین امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔ ان کو وزٹ کرا دینا۔ میں ان کو بھیج رہی ہوں۔

یہ دو خواتین کرس اور پیم تھیں جو چلڈرن ریسورس انٹرنیشنل امریکہ سے آئی تھیں اور جو 35 ممالک میں بچوں پر مرکوز طریقۂ تعلیم کو عام کر رہی تھیں۔ میں انھیں افغان آبادی میں پہلے لے گیا جہاں پر انھوں نے ہمارے غیر رسمی سکول دیکھے۔ وہاں سے نکلتے ہوئے کرس کا پاؤں نالی میں چلا گیا اور اس کی جراب گیلی ہوگئی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے

فوراً ایک بچے سے پانی منگوایا اور اس کے پاؤں پر ڈالا۔ اس کا پاؤں صاف ہوگیا۔ کرس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں ڈھوک حسو میں موجود پرائیویٹ اور گورنمنٹ سکولوں میں لے گیا۔ پھر ABES میں ایڈون سیمسن کے پاس لے گیا۔ مجھے کچھ علم تھا کہ یہ بیبیاں کیا کرنا چاہتی ہیں اور نہ ہی مہناز کے علم میں تھا۔ ایڈون سیمسن سمجھ گیا کہ یہ لوگ پاکستان میں اپنے ادارے کی برانچ بنانا چاہتے ہیں۔ بہر حال انھیں وزٹ کروایا اور واپس اسلام آباد رخصت کر دیا۔

کچھ دن بعد مہناز کا فون آیا۔ حمید اللہ تمھارا پاسپورٹ ہے میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا فوراً بنا لو۔ ارجنٹ۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو مجھ سے لے جاؤ۔ میں نے فوراً پاسپورٹ بنوا لیا۔ اپنی سی وی بنا کر مہناز کے گھر چھوڑ آیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ CRI کی بیبیوں نے مہناز کو پاکستان میں کنٹری ڈائریکٹر کے طور پر چن لیا ہے اور مہناز پاکستان میں اپنے ادارے کے لوگوں کا انتخاب کر رہی ہیں جو واشنگٹن ٹریننگ کے لیے جائیں گے اور واپس آ کر پاکستان میں تعلیم پر کام کریں گے۔

مجھے ایک دن علی الصبح گھر پر مہناز نے بلایا۔ میں پہنچ گیا۔ مہناز گھر پر کراچی سے آئے ہوئے ریاض صاحب پر ناراض ہو رہی تھیں کہ جس خاتون کا نام انھوں نے دیا تھا اس کی جگہ دوسری خاتون کیوں لے آئے ہیں۔ بہر حال ہم دو مرد اور دو خواتین مہناز کے ابا کی گاڑی میں امریکی اتاشی کا خط لے کر سیدھا US ایمبسی میں چلے گئے۔ وہاں پر بغیر لائن میں لگے ہم ویزہ سیکشن میں چلے گئے۔ جہاں پر ہمارا انٹرویو ہوا۔ مجھ سے انھوں نے تنخواہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ ماہانہ دو ہزار روپے ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی آمدن کم ہے۔ میں نے جواب میں بتایا کہ میں غریب ہوں۔ میری تنظیم امیر ہے جس کا میں ٹرسٹی

ہوں، جس کے کاغذات میں نے دکھائے۔ پھر دوسرا میں نے بتایا کہ آپ کا ادارہ مجھے ٹریننگ کے لیے بلا رہا ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں امریکہ جانے کا۔

بہر حال باقی تین لوگوں کو ویزا مل گیا۔ مجھے اس لیے نہیں ملا کہ 9/11 میں جن لوگوں نے حملہ کیا تھا ان کی عمریں 16 سے 45 سال کی تھیں۔ میں بھی اس عمر میں تھا جس کی وجہ سے میری دو ماہ تک نگرانی ہونی تھی لیکن ٹریننگ چونکہ اگلے ماہ تھی اس لیے دو ماہ کے بعد ویزے کا فائدہ نہیں تھا۔ لہٰذا میرا ویزہ کینسل ہو گیا۔

میں واشنگٹن نہیں جا سکا۔ مہناز چار پانچ افراد کے ساتھ ECE کی ٹریننگ حاصل کر کے واپس آ چکی تھی۔ ٹریننگ کے بعد مجھے مہناز نے اپنے گھر پر بلایا اور نوکری کی پیشکش کی۔ میں نے کہا دوستوں سے مشورہ کر کے بتاؤں گا۔ دراصل میں نوکری کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ابا کا قول تھا کہ چھابا لگاؤ لیکن اپنا لگاؤ۔ میرے دادا کہا کرتے تھے کہ نوکری والد کی بھی اچھی نہیں ہوتی۔

مئی 2002ء میں میری بیوی ماں بننے والی تھی۔ میں اُسے ہسپتال لے گیا۔ داخلے کیلیے آٹھ ہزار روپے درکار تھے جو میرے پاس نہیں تھے۔ میں نے ادھار لیا اور ہسپتال میں جمع کرا دیئے۔ 12۔ مئی کو ہمارے ہاں بچی پیدا ہوئی لیکن وہ ایک دن کے بعد فوت ہو گئی۔ ہم سب بڑے دکھی ہوئے۔ میں سوچتا رہا کہ کاش میں اسے کسی اچھے ہسپتال میں لے جاتا تو شاید ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے تو یہاں کے لیے بھی ادھار لیا تھا کیونکہ میری تنخواہ دو ہزار روپے تھی۔ اگرچہ میرے ادارے میں انھیں دنوں یو این ڈی پی سے 25 لاکھ روپے آئے تھے لیکن میں اُس پہ دستخط کے اختیار کے باوجود یہ رقم استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ادارے کے پیسے تھے۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا اور 20۔

مئی 2002ء کو میں نے نوکری شروع کر لی۔ مہناز نے بیوی، بچے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا اچھی خبر نہیں ہے۔ وہ سخت ناراض ہوئی تم نے بتایا کیوں نہیں۔ میں نے کہا سب کچھ جلدی میں ہو گیا۔ ہم دن بھر مہناز کے انیکسی میں بیٹھے رہے اور CRI پروگرام پر عملدرآمد کے منصوبے بناتے رہے۔ ایک دن مہناز نے بلایا اور پوچھا کہ تنخواہ کتنی لو گے۔ میں نے کہا مہناز میں جہاں کام کر رہا تھا وہاں سے دو ہزار روپے لے رہا تھا۔ آپ تین ہزار دے دیں۔ انھوں نے کہا تین نہیں یہ بہت کم رقم ہے۔ میں نے چالیس چالیس ہزار پر لوگ رکھے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر مجھے پانچ ہزار دے دیں۔ انھوں نے کہا نہیں یہ بھی کم ہے۔ میں نے کہا تو پھر ٹھیک ہے آٹھ ہزار کر دیں۔ نہیں نہیں میں تمھیں بارہ ہزار دوں گی۔ مہناز نے کہا۔ میں نے کہا یہ تو مزے ہو جائیں گے۔ ایک ماہ بعد جب مجھے تنخواہ کا چیک دیا گیا تو وہ سولہ ہزار کا تھا۔ میں مہناز کے پاس چلا گیا اور کہا کہ آپ نے میرے ساتھ بارہ ہزار کا وعدہ کیا تھا۔ یہ سولہ کا چیک کیوں دیا۔ انھوں نے ساتھ کھڑے ایڈمن آفیسر کو کہا اس نالائق کو لے جاؤ اور سمجھاؤ۔ بہر حال میری پہلی نوکری کی تنخواہ سولہ ہزار مقرر ہوئی۔ پہلی اس لحاظ سے تھی کہ گزشتہ دس سال میں نے جن اداروں میں کام کیا وہ میرے اپنے بنائے ہوئے ادارے ہوتے تھے۔ لیکن یہ پہلی مرتبہ میں کسی بیرونی ادارے میں جا کر کام کر رہا تھا۔

20۔ جون کو میں امریکہ انٹرنیشنل وزیٹر کے طور پر گیا۔ وہاں دس سے زیادہ ریاستوں کا تعلیمی نظام، ادارے اور یونیورسٹیاں وغیرہ دیکھیں۔ 25 جولائی کو واپس پاکستان آ گیا۔

یہاں آنے کے بعد باقاعدہ دفتر ایمبسی روڈ پر بن چکا تھا۔ سٹاف رکھ لیا گیا۔

کراچی میں بھی دفتر قائم ہو گیا تھا۔ راولپنڈی، کراچی اور اسلام آباد ڈسٹرکٹ کے تعلیمی اداروں کے ساتھ معاہدوں پر دستخط ہو چکے تھے۔ ٹریننگ کی تیاریاں تھیں۔ امریکہ سے ٹرینر نے آنا تھا۔ اگست میں راولپنڈی اسلام آباد کے لیے پہلی ٹریننگ منعقد ہوئی جس میں کچی اور پکی جماعت کے اساتذہ نے مع اپنے سربراہوں کے شرکت کی۔

میں نے CRI میں جو بعد میں CGN بن گیا تھا آٹھ سال گزارے۔ اس دوران مجھے مختلف رول دیئے گئے۔ عام طور پر جو نیا کام مہناز شروع کرتی۔ اس کی بنیاد کے لیے مجھے استعمال کرتیں۔ مہناز دفتر میں باقی لوگوں کی طرح میرا میز اور کمرہ بھی تبدیل کرتی اور ہم بھی کسی فوجی کی طرح ہر وقت حکم لیے تیار رہتے کہ کب کسی دوسرے یونٹ میں تبدیلی ہو گی۔ بہرحال نوکری کے دوران بہت ساری تلخ، ترش اور شیریں یادیں ہیں جس کے لیے الگ کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے تعلیمی نظام کو سمجھنے اور اس میں بہتری کے طریقے بہت تفصیل سے سیکھے۔ امریکی ٹرینر تسلسل کے ساتھ ہر چھ ماہ بعد آتے رہے اور یہاں کے منتخب سکولوں کے اساتذہ کو مرحلہ وار تربیت دیتے رہے۔ ہم بطور مددگاران کے ساتھ کام کرتے رہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ میں نے تنخواہ کی رقم میں سے ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کیا۔ آٹھ سال میں میں نے گھر، پلاٹ اور گاڑی بنالی۔ گھر کا خرچ میری بیوی اپنی تنخواہ سے چلاتی رہی۔

میری آخری تعیناتی بونیر، سوات میں تھی جہاں کے پراجیکٹ کا میں کوآرڈینیٹر تھا اور میں نے ایک سو گورنمنٹ سکولوں کے اساتذہ کو تربیت فراہم کرنی تھی۔ میں نے تسلسل کے ساتھ ایک سال کام کیا اور نہ صرف پراجیکٹ کی بنیاد اچھی رکھی بلکہ خود اساتذہ

کو ٹریننگ بھی دی۔

جون 2010ء میں جب اساتذہ کی آخری ٹریننگ اختتام کو پہنچی تو میں واپس دفتر آیا۔ جہاں سے مجھے گھر آنا تھا۔ مجھے فون آیا کہ اپنی ای میل چیک کرو۔ جب میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مجھے بلامعاوضہ تنخواہ پر چھٹی پر بھیج دیا گیا ہے۔ نیچے مہناز کے دستخط تھے۔ میں نے پرنٹ آؤٹ لیا اور گھر آ گیا۔ میں نے اپنا وعدہ وفا کیا کہ میں کبھی بھی نوکری سے استعفیٰ نہیں دوں گا۔ آپ جب چاہیے مجھے واپس بھیج دیجیے گا۔ میں واپس اپنے ادارے میں آ گیا ہوں۔ یہ میری پہلی اور آخری نوکری کے تجربات ہیں۔

بچپنے کی تعلیم

(Early Childhood Education)

انسان کا دماغ 80 فیصد پہلے پانچ سال میں پروان چڑھ جاتا ہے لیکن ہمارے بچوں پر ابتدائی عمر میں توجہ نہیں دی جاتی۔ عدم توجہگی سے بچے کی بنیاد اچھی نہیں بنتی جس سے بعد میں عمارت بھی ڈگمگاتی رہتی ہے بلکہ بعض جگہ پر اتنا ظلم ہے کہ اگر بچہ زیادہ تنگ کرے تو تھوڑی سی افیم کھلا دی جاتی ہے تا کہ بچہ سو جائے۔ ماڈرن مائیں کھانسی اور بخار کا شربت پلا دیتی ہیں جس میں غنودگی ہوتی ہے اور بچہ سو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا دماغ پوری طرح پروان نہیں چڑھتا اور تخلیقی عمل سے پاک ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری ریاست بھی بچوں پر پانچ سال کے بعد اخراجات کرتی ہے۔ اس سے پہلے توجہ نہیں دی جاتی۔ اگرچہ گلی محلے کے سکولوں میں تین سے پانچ سال کے بچوں کو داخلہ مل جاتا ہے۔ چونکہ یہاں اساتذہ زیادہ تربیت یافتہ نہیں ہوتے اور اس عمر میں داخلے کا مطلب صرف فیس کا حصول ہوتا ہے اس لیے بچے کوئی خاطر خواہ نتائج نہیں دے پاتے۔

اس ساری صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں دو تجربوں سے گزرا ہوں۔ ایک پہلے تین سال کا تجربہ جو بچوں کے ساتھ براہِ راست تو نہیں۔ ان کی ماؤں کے ساتھ ہے جس پر تفصیلی بحث ہم والدین کی تعلیم والے حصّے میں کریں گے جبکہ دوسرا تجربہ تین سے پانچ سال کے بچوں کا ہے۔

پہلی بات تین سے پانچ سال کے بچوں کے لیے نصاب کی تھی۔ پاکستان میں اس پر بہت کم کام ہوا ہے۔ حکومت پاکستان کے نصابی ادارے نے اگرچہ ایک کتاب بنائی ہے لیکن اس میں زبانی جمع خرچ زیادہ ہے۔ عملی چیزیں کم ہیں۔ میں نے جو اُس کے بارے میں پروگرام دیا وہ کچھ یوں تھا کہ نصاب پہلے سال کا 52 ابواب پر مشتمل ہو اور دوسرے سال کا الگ 52 ابواب ہوں۔ ہر باب میں الگ موضوع ہو جو پورا ہفتہ چلے۔ بچہ گھر کے قریب الگ جگہ پر ہفتے میں پانچ دن دو گھنٹوں کے لیے جائے اور وہاں موجود زیادہ سے زیادہ دس بچوں کو ایک ماں مختلف سرگرمیاں کرائے۔ نصاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بچے کی تمام حسیں متحرک ہوں۔ اُس کی نہ صرف جسمانی نشوونما بلکہ دماغی نشوونما بھی ہو۔ بچے کو ابتدائی لکھائی کا ڈھنگ آئے۔ جو آڑی ترچھی لائنیں ہوں، رنگوں اور مٹی سے اُس کے ہاتھ چلیں۔ سونگھنے اور چکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو۔ وہ مختلف اشکال اور رنگوں کی پہچان کر سکے۔ سماج میں موجود اداروں کے بارے میں آگاہی حاصل کرے۔ رشتوں کی پہچان کرے۔ کھانے پینے کی اشیاء سے واقف ہو۔ پرندوں اور جانوروں کے نام جان سکے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے مسلسل تین ماہ مختلف ماہرین تعلیم کی کتابیں اور ریسرچ پڑھی اور 34 کے قریب اسباق ترتیب دیے۔

دوسرا مرحلہ ایسی ماؤں کا انتخاب کرنا تھا جو یہ اسباق بچوں تک پہنچائیں۔ ہم نے دس ایسی ماؤں کا انتخاب کیا جو ہمارے تعلیم بالغاں کے پروگرام سے استفادہ حاصل کر چکی تھیں۔ ان کی تین روزہ تربیت کی۔ دس سے پندرہ ہزار کا سامان ان ماؤں کو بچوں کے لیے دیا اور اس بات کی اجازت بھی دی کہ وہ ان بچوں سے پچاس یا سو روپے ماہانہ فیس

وصول کر سکتی ہیں۔

یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔ گھروں میں تین سے پانچ سال کے بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے دس سینٹر قائم ہو گئے اور ہر سینٹر میں دس سے پندرہ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بچے ماہانہ فیس ادا کرتے۔ جو ماں یہ سینٹر چلاتی اس کو روزگار مل گیا۔ یہ تجربہ ہم نے شہری علاقے میں کیا۔ بعد میں تیس کے قریب سینٹر دیہی علاقوں میں بنائے گئے جو اس سے زیادہ کامیاب رہے۔ ہم نے وہاں یہ بات عام کی کہ اگر کوئی نقد رقم نہیں دے سکتا تو دانے یا انڈے بھی ٹیوشن فیس کی مد میں دے سکتا ہے۔

اگرچہ دیہی علاقوں میں بڑے بڑے گھر ہوتے ہیں اور ایک ہی گھر میں دس سے پندرہ بچے مل جاتے ہیں جن کی چاچی یا مامی کو تربیت دے کر آپ یہ کام کروا سکتے ہیں جو گھر کے بچوں کی خاطر بلا معاوضہ یہ کام کر سکتی ہے۔

پہلی اور دوسری، دونوں مرتبہ میرے اوپر دباؤ رہا کہ ماں کو ماہانہ اعزازیہ دیا جائے لیکن میں اس حق میں نہیں تھا کیونکہ جب تنخواہ بند ہوتی ہے تو سکول بھی بند ہو جاتا ہے۔ اس لیے میرا زور اس بات پر تھا کہ مقامی لوگوں سے ماہانہ اعزازیہ لیا جائے جو ٹیوشن فیس ہو اور جس میں مجھے کامیابی ہوئی۔

تعلیم بالغاں

تعلیم بالغاں کے تجربے پاکستان میں بے شمار ہوتے رہے ہیں اور زیادہ تر ناکام ہوئے ہیں۔ میں نے جو طریقہ سیکھا اس کی ڈائزیننگ مختلف تھی اور والدین کی تعلیم کو بچوں کی تعلیم کے ساتھ جوڑا گیا۔ جس کی وجہ سے ماضی کے مقابلے میں اس پروگرام کو زیادہ کامیابی ملی۔

ایک سو اسباق ترتیب دیئے گئے تھے۔ ہر سبق میں ایک طریقہ تھا جس کی مدد سے پہلے خود سیکھنا ہے اور پھر بچوں کو سیکھانا ہے جس میں ریاضی، سائنس، لکھائی، پڑھائی، کہانی سنانے کے طریقے، مختلف کھیل کے اسباق موجود ہیں۔ یہ سارے اسباق ایک امریکی ماہر تعلیم نے ترتیب دیئے جو 75 سال کی ایک بوڑھی خاتون تھی۔

اس پروگرام کو آگے پہنچانے کے لیے سرکاری سکولوں کے اساتذہ کا انتخاب کیا گیا۔ یہ اساتذہ ہفتے میں دو دن، دو، دو گھنٹوں کے لیے سکول کے اندر اپنی کلاس کے بچوں کے 20 والدین کو یہ اسباق پڑھاتے اور یہ والدین گھروں میں جا کر اپنے بچوں کے ساتھ ان اسباق کی دہرائی کرتے اس طرح نہ صرف والدین خواندہ ہو رہے تھے بلکہ بچے بھی پڑھ رہے تھے۔

یہ تجربہ اور اس کا ڈیزائن میرے لیے انوکھا تھا۔ ان اساتذہ کو ماہانہ ایک ہزار روپے معاوضہ دیا جاتا اور یہ تجربہ پاکستان کے تین بڑے شہروں میں کیا گیا جو سب سے

کامیاب رہا۔

ان اساتذہ کو پہلے پانچ دن اور بعد میں تین دن کی تربیت دی جاتی۔ اسباق 50،50 کی دو جلدوں پر مشتمل تھے۔

عموماً والدین دن میں دیر سے آتے جس کے لیے قسط وار ایک ناول شروع کیا گیا جسے سننے کے لیے والدین بروقت پہنچ جاتے۔

بہت ساری خواتین کو ان کے سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر نوکری بھی دی گئی۔

والدین کی آمد کے موقع پر ایک ٹیسٹ لیا جاتا جس میں نام وغیرہ لکھنے اور پڑھنے کی ترغیب ہوتی۔ بعد میں اس عمل کو دہرایا جاتا تاکہ اس بات کا پتہ چلایا جاسکے کہ والدین نے کتنا سیکھ لیا ہے۔ پہلے پچاس اسباق مکمل ہونے پر سند بھی دی جاتی تھی۔

اساتذہ کی تربیت کے دوران خاص قسم کے میٹریل سے استفادہ کیا جاتا جو روایتی طریقے سے مختلف ہوتا اور بعد میں یہ میٹریل سپلائی کے طور پر ہر ٹیچر کو دیا جاتا جس میں کتابیں، مختلف اشکال استعمال کے لیے کاغذ، رنگ وغیرہ شامل تھے۔

اگرچہ اس پروگرام کے پس منظر میں خاصی سرمایہ کاری موجود تھی لیکن تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اس کے ڈیزائن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جو والدین کے لیے ترغیب کا باعث بنے گا اور ان کے بچوں کو بھی گھر پر ٹیوٹر مہیا ہوگا۔ سرکاری سکولوں کا شام کے اوقات میں استعمال ہوسکے گا۔

اپنا گھر

2000ء کے اوائل میں ہماری شادی ہوئی۔ ہم دونوں میاں بیوی سماجی خدمات میں سرگرم تھے۔ ہم نے اپنی تنخواہ اپنے ادارے میں دو، دو ہزار روپے مقرر کی تھی۔ ہم نے شادی بھی بڑے سادے انداز سے کی تھی جس پر غالباً پانچ سو روپے خرچ آئے تھے کیونکہ ہم نے نئے کپڑے جوتے نہیں بنائے۔ میں اپنے ایک بھائی کے ساتھ کھاتا پیتا تھا۔ لہٰذا میری بیوی بھی وہیں پر آ گئی اور ہمارے اخراجات کچھ زیادہ نہیں تھے۔ میں نے خود اپنے پیسوں سے آبائی گھر میں ایک کمرہ اپنے لیے بنایا تھا جو ہمارے لیے کافی تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگلے دس سال یعنی 2010ء تک اس کمرے میں رہیں گے اور اس کے بعد اپنا گھر بنانے کا سوچیں گے۔

2002ء میں مجھے نوکری مل گئی اور میری تنخواہ دو سے بڑھ کر سولہ ہزار روپے ہوگئی۔ یہ رقم ساری بچ رہی تھی کیونکہ ہمارے گھریلو اخراجات زیادہ نہیں تھے۔ جو تھے وہ میری بیوی کے دو ہزار روپے تنخواہ سے چل رہے تھے۔ ہم دونوں سبزی خور ہیں۔ کپڑے، جوتے بھی زیادہ مہنگے نہیں پہنتے لہٰذا ہماری بچت زیادہ تھی۔ میں نے پہلی ایک دو تنخواہوں میں گھر کے کچھ برتن اور ایک گدہ اپنے لیے خریدا لیکن بعد میں پیسے بچاتے رہے۔

پہلے سال ایک لاکھ روپے سے زیادہ جمع ہوگئے۔ ہمارے ایک جاننے والے ناظم دوست تھے جو پراپرٹی کا کام بھی کرتے تھے۔ ہم ان کے پاس گئے میرے ہمراہ میرا

کزن بھی تھا جو پلاٹ لینے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ہم دونوں نے ناظم صاحب کو بتایا کہ ہمیں کوئی سستے سے پلاٹ جو پانچ پانچ مرلے کے ہوں بتائیں۔ وہ ہمیں ایک پلاٹ پر لے گئے جو اکٹھے دس مرلے کا تھا۔ ہم نے پلاٹ پسند کیا اور کہا دس مرلے کی قیمت بتائیں۔ انھوں نے پانچ لاکھ روپے بتائے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ ہم نے ایک ایک لاکھ روپے ایڈوانس دیا اور باقی کا ٹائم لے لیا۔ پھر بعد میں تھوڑے تھوڑے کر کے باقی رقم بھی ادا کر دی۔ اس طرح ایک بندے کو اڑھائی لاکھ روپے میں پلاٹ مل گیا۔ اب اگلا مسئلہ درپیش تھا کہ اس پر گھر تعمیر کیسے کیا جائے؟ ان دنوں مختلف بنک قرضے دے رہے تھے۔ ہم نے ایک دو بنکوں سے بات کی لیکن وہ اے ٹائپ پراپرٹی کو ترجیح دے رہے تھے۔ بہرحال ہم پھر ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے پاس گئے۔ انھوں نے طویل جدوجہد کے بعد ہمارے لیے ساڑھے سات لاکھ اور میرے کزن نور اسلام کے لیے ساڑھے نو لاکھ قرض منظور کیا۔ اس رقم سے ہم نے تعمیر کا آغاز شروع کیا۔ پانچ پانچ مرلے میں تین تین منزلہ گھر بنا لیے۔ اوپر والے دو دو پورشن کرایے پر لگا دیئے۔ نیچے والی منزل میں خود شفٹ ہو گئے۔ اب اوپر والی منزلوں سے جو کرایہ آتا ہے وہ HBFC کی اقساط میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح صرف اڑھائی لاکھ کی انوسٹمنٹ سے ہمیں ایک شاندار گھر مل گیا۔ ہم 2004ء میں اس گھر میں شفٹ ہو گئے۔ ہم اپنی اس کامیابی کو انجوائے کرتے ہیں۔ جب ہم پچپن برس کے ہو جائیں گے تو تب تک HBFC کا لون ختم ہو جائے گا اور اگر زندہ رہے اور کوئی حادثہ نہ ہوا تو یہ کرایہ ہمارا اولڈ ایج بینفٹ یا پنشن ہوگا۔

بونیر سوات میں ایک سال

سوات میں فوج اور طالبان کی لڑائی میں زیادہ نقصان سکولوں کو پہنچا۔ آپریشن کے اختتام پر مجھے موقع ملا کہ بونیر کے سکولوں میں کام کروں۔ یہ تقریباً 100 گورنمنٹ کے سکول تھے جو پانچ یونین کونسلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ زیادہ تر پہاڑی علاقہ تھا۔ جب میں شروع میں سروے کرنے گیا تو میرے آفس والوں نے مجھے گاڑی بھی نہیں دی شاید اس ڈر سے کہ گاڑی کو کچھ ہو جائے گا۔ میں اپنی ذاتی گاڑی میں گیا۔ پختونوں کی روائتی ٹوپی اور واسکٹ پہنی اور بونیر پہنچ گیا۔ اگرچہ میرا گاؤں بھی یہاں قریب تھا لیکن میری پیدائش راولپنڈی میں ہوئی تھی اور یہیں پرورش ہوئی تھی۔ میں پشتونوں کو اتنے قریب سے نہیں جانتا تھا جتنا اس سال میں میرا تجربہ ہوا۔ میں نے یہاں اپنے ماموں کا سہارا لیا جو شاعر ہے اور وہ اکثر مشاعروں میں یہاں گھومتا ہے۔ مجھے پہلے دن ایک حجرے میں لے گیا اور کلچر کے مطابق نماز لازمی تھی لہٰذا میں بھی مسجد چلا گیا۔ جس مسجد میں نماز پڑھی اس کے امام صاحب تحریک نفاذ شریعت کے تھے اور بعد میں اس علاقے میں طالبان کے کمانڈر تھے۔ میری ٹوپی اور واسکٹ کے باوجود لوگ پہچان رہے تھے کہ یہ اجنبی ہے اور سب مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ لوگ اسلحہ کے ہمراہ نماز پڑھ رہے تھے اور چونکہ رمضان تھا۔ لوگوں نے افطاری بھی مسجد میں کی تھی۔ مجھے بھی نماز کے بعد چائے مسجد میں پیش کی گئی۔ ابتداء میں میں اپنے میزبان سے بھی چھپا رہا تھا کہ میں کسی NGO اور امریکی NGO کا نمائندہ ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں فیڈرل ڈائریکٹوریٹ میں کام کرتا ہوں اور اس غرض سے آیا ہوں کہ یہاں کے سکولوں کو درست کر سکوں۔ ان میں اساتذہ کو تربیت

دے سکوں اور میں نے دفتر کے لیے جگہ تلاش کی لیکن عام سے مکان کے کرائے بھی بہت مہنگے تھے کیونکہ بہت سی NGOs کے کوآرڈینیٹر یہاں پر مکان تلاش کر رہے تھے اور مقامی لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ غیر ملکی ہے پیسہ زیادہ مانگو۔ ایک ہفتے میں دس مکان تلاش کیے بالآخر وہاں سے واپس آ گیا اور قریبی ڈسٹرکٹ صوابی میں دفتر لے لیا۔ سٹاف کی تعیناتی کی۔ سکولوں کا سروے شروع کر دیا۔ DCO کے پاس ریگولر ماہانہ کوآرڈینیشن میٹنگ ہوتی۔ ہم اس میں جاتے اور اپنے پراجیکٹ کی پیش رفت بتاتے۔ حسن اتفاق تھا کہ یہاں کے ایک ممبر قومی اسمبلی صوبے کے وزیر تعلیم تھے۔ میں نے ابتداء میں ہی ان سے رابطہ رکھا کیونکہ میرے ماموں کی ان سے بھی جان پہچان تھی۔ میں نے یہاں سو سکولوں کے اساتذہ کی تربیت کے ساتھ ساتھ تیس سینٹر بھی بنانے تھے جو ماؤں نے گھروں میں چلانے تھے جس میں تنخواہ تو نہیں تھی البتہ میٹریل ضرور تھا۔ یہ دس سے پندرہ بچوں کے لیے تھا جن کی عمریں تین سے پانچ سال کی تھیں۔

ہماری تنظیم کی روایت تھی کہ گورنمنٹ کے ساتھ معاہدے پر دستخط ہو۔ ہم ایم او یو، ڈی سی او کے پاس لے گئے۔ وہاں انھوں نے ایک کوآرڈینیٹر مقرر کیا تھا۔ میں نے اس کو بریف کیا۔ اُسے بات سمجھ آ گئی۔ وہ اندر گیا DCO کے گھر اور اُسے بریف کیا۔ DCO کو بخار تھا۔ اس لیے گھر پر تھا۔ جب ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے کہا میں دستخط کر دیتا ہوں۔ ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ MOU پر دستخط ہو گیا۔ ٹریننگ کی تاریخوں کا اعلان ہو گیا۔ اس دوران میرے ایک اور دوست عابد حسین کا تبادلہ اس پراجیکٹ میں میرے ساتھ کر دیا گیا۔ وہ بنیادی طور پر تو چکوال کا ہے لیکن ہم اسلام آباد میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ میں اختر شاہ، عابد حسین اکٹھے شام کو گلی میں گھومتے اور ایسے ایسے محاورے ایجاد کرتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ یہاں بھی ہم دن بھر پہاڑوں میں

گھومتے اور شام کو ہوائی چپل پہن کر نہر کے کنارے سیر کرتے اور ساتھ ساتھ پلاننگ کرتے۔ دفتر میں ہمارے پاس پانچ مرلے خالی جگہ تھی۔ اس میں ہم نے سبزی لگا دی اور روزانہ کوئی نہ کوئی سبزی تازہ پکاتے اور مزہ کرتے۔

ہم نے خواتین اور مردوں کی الگ الگ تربیت شروع کر دی۔ عابد حسین اردو میں پڑھاتا اور میں پشتو میں پڑھاتا۔ ہم نے ٹیچروں کے گھروں میں رہنے کا فیصلہ کیا کیونکہ روزانہ آنا جانا مشکل تھا۔ ٹیچر ایک دن پہلے ہمیں بتاتے کہ کل آپ میرے مہمان ہوں گے۔ ہم شام کو کام ختم کر کے اس ٹیچر کے ہمراہ چلے جاتے۔ اس کے گھر میں سامان رکھ کر ہم پہلی یہ فرمائش کرتے کہ ہمیں کسی چشمے پر لے جاؤ۔ وہاں نہاتے، خوب انجوائے کرتے۔ رات کو پرتکلف کھانا کھاتے اور علاقے کی روایات پر بات چیت کرتے۔ والی سوات کی کہانیاں سنتے۔ اکثر استاد اردو کم بولتے۔ میں عابد کے لیے باتیں ترجمہ کرتا۔ ٹریننگ میں پہلی دفعہ کھانا تو ہوٹل سے منگوایا لیکن اساتذہ زیادہ خوش نہیں تھے۔ اگلی ٹریننگ میں اساتذہ نے کہا کہ آپ کھانے کے پیسے نقد دے دیں۔ ہم خود انتظام کریں گے۔ ہمارے ادارے نے مطالبہ مان لیا۔ ٹیچروں نے گاؤں کا پکوائی والا بلایا اور وہ روزانہ ایک نئی ڈش بناتا جو ہم مزے سے کھاتے۔ اکثر اساتذہ پارٹ ٹائم یا تو دوکانیں چلاتے یا تمباکو اگاتے۔

ہماری ٹریننگ کی بہت ساری باتیں ہیں جنھوں نے ٹیچر کو اپیل کیا لیکن میں نے مقامی روایات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں بتایا کہ آپ جو نسل تیار کر رہے ہیں یہ وہ بے کار تمباکو ہے جو صرف نسوار میں استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ ورجینا تمباکو نہیں ہے جو گولڈ لیف میں استعمال ہو۔ ان کے ہاتھ پاؤں نہیں چلتے۔ پرائمری میں پانچ سال گزارنے کے باوجود لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ یہ بچوں کے ساتھ اور بالخصوص اپنی قوم کے ساتھ ظلم ہے۔ جس کا ازالہ ہمیں

آج کرنا پڑ رہا ہے اور ہم اپنے گھروں سے در بدر ہو گئے تھے۔ آپ کو بچوں کو پڑھانا ہوگا جو نہ صرف قابل انسان بنے بلکہ اچھا شہری بنے۔ اساتذہ ہماری ان باتوں اور سرگرمیوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتے۔

راتوں رات غربت کا خاتمہ

فوجی کابینہ کے آخری سانسوں میں امریکہ کے خزانے کے سیکرٹری پاکستان تشریف لائے ۔ایک ماہ قبل ہی جان تھن نے ہمیں بتایا تھا کہ سیکرٹری خزانہ کو کسی ایسے سکول میں لے جانا ہے جہاں پر پاکستان کی تعلیم کا حقیقی رخ نظر آئے۔ ہماری تنظیم نے فیصلہ کیا کہ ڈھوک منشی لے جایا جائے ۔ جو کہ ایک غریب بستی ہے اور جہاں کے سکول بھی ناگفتہ بہ حال میں ہیں۔ اگلے دن جوناتھن کو ڈھوک منشی کے دو سکول دکھائے جس میں اسے ایک پسند آیا۔ کچھ دنوں بعد USAID میں نئی تعینات افسر سویرا کا فون آیا کہ مزید لوگ سکول کو سیکیورٹی اور انتظامی حوالے سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں ڈپٹی مشن لارنس بھی ہیں ۔جس کی اطلاع مجھے میرے گھر پر رات کو مہناز نے دی اور حکم ہوا کہ صبح سات بجے دفتر پہنچنا ہے۔ میں تابعدار نوکروں کی طرح ایک گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ گھنٹہ بھر گارڈ اور گک کے ساتھ تازہ ترین صورتحال پر گفت وشنید کرتا رہا کہ سویرا آ گئی اور مجھے فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر ساتھ لے گئی۔ ہم لوگ نئے نویلے ہوٹل سرینہ کے استقبالیہ پر پہنچ گئے، ساڑھے سات کے قریب لارنس آیا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سیکیورٹی والے ابھی تک نہیں پہنچے تھے ہم لوگوں نے مزید آدھا گھنٹہ انتظار کیا اور چل پڑے۔ لارنس نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور خود چلاتے ہوئے لے گیا۔ راستے میں اپنے موبائل فون سے سیکیورٹی والے کے نہ آنے کی شکایت بھی اپنے دفتر میں درج کروائی۔ ہم کچھ ہی دیر میں ڈھوک منشی پہنچ گئے ۔میں نے تفصیل سے بتایا کہ اس سکول کو آنے والے دو راستے ہیں ایک تو کچا ہے دوسرا پکا۔لیکن اس میں مصروف بازار ہے۔ جس سے گزرنا شائد اچھا نہ ہو۔ بہر حال دونوں

راستے انہوں نے دیکھ لیے۔ سیکرٹری خزانہ کی آمد سے قبل واشنگٹن سے ٹیم سیکیورٹی چیکنگ کے لیے آئی۔ جو دس سے زیادہ افراد تھے۔ انہوں نے اس سکول کو منسوخ کر دیا کہ اردگرد مکانات ہیں جس سے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال ہم لوگ مایوس واپس چلے آئے اور مہناز کو بتایا۔ انہوں نے G-6 کا سکول تجویز کیا جو ناتھن اور سویرا کو پسند نہیں آیا اور دونوں خود سکول کی تلاش میں نکل گئے۔ ہماری ٹیم کی فاخرہ بتا رہی تھی کہ وہ مختلف سکولوں کے گیٹ کے سوراخوں میں دیکھتے رہے کیونکہ سکول بند ہو چکے تھے اور اگلے دن تک سکول کا انتخاب کرنا تھا۔

بالآخر مری روڈ پر مل پور گاؤں کے ایک ایف جی سکول کا انتخاب کیا گیا۔ جس میں غربت نظر آئی۔ اگلے دن فیڈرل ڈائریکٹریٹ میں D.G. سے میٹنگ کی گئی اور دورے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ خوشی خوشی تمام پروگرام کو ترتیب دیا گیا ور سب کچھ طے ہو گیا۔

مہناز نے میری ذمہ داری لگائی کہ "حمید اللہ جاؤ اور سکول کا جغرافیہ معلوم کر کے آؤ" میں گیا، مری روڈ تک تو روڈ پکا تھا لیکن آگے تین فرلانگ کچا اور پھر پتھریلہ تھا۔ اور جو ناتھن کی غربت پر پورا اتر رہا تھا۔

وزٹ سے ایک دن پہلے مہناز کے امی، ابا کو سکول دیکھنا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے پکے روڈ پر ہی ان کو ذہنی طور پر تیار کر لیا کہ اب کچھ راستہ کچا ہے لیکن میری حیرت کی انتہا ہو گئی کہ روڈ پر خاکہ ڈال کر ہموار کر لیا گیا تھا جب سکول پہنچے تو جھاڑیاں کاٹ دی گئی تھی۔ سکول کے سامنے گوبرا اٹھا لیا گیا تھا بے شمار لوگ لگے ہوئے تھے۔ کھڑی ہوئی چیز کو چونا لگا رہے تھے اور چلتی چیز کو سلام کر رہے تھے۔ بلکہ یہاں تک کہ اساتذہ اور بچوں کو درآمد کیا جا رہا تھا۔ جب یہ ساری صورتحال میں نے مہناز کو بتائی تو انہوں نے

پیشین گوئی کی کہ کل تک گملے بھی آ جائیں گے اور یہی ہوا۔ جب ہم وزٹ والے دن صبح پہنچے تو سفید کلائی والے گملے ہر جگہ موجود تھے۔ استقبالیہ پر ایک چمکیلے کپڑوں والی خاتون نے مہناز سے بارعب انداز میں پوچھا آپ یہاں ٹیچر ہیں۔ تو مہناز نے اپنا تعارف کروایا، لیکن سیکورٹی سخت تھی، اس نے دوبارہ موبائیل اور کیمرے کا پوچھا۔ موبائیل مہناز نے ڈرائیور کو دے دیا اور کیمرا میں لے جانا بھول گیا تھا۔ جب دونوں چیزوں کا جواب نفی میں ملا تو اندر جانے کی اجازت مل گئی اور مہناز آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ میں مچھلی کی کہانی والی دو کتابیں اور ترجمے بغل میں دبائے پیچھے پیچھے باادب جا رہا تھا اور دل میں مہناز کے بحفاظت نیچے زمین پر اترنے کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ ہم لوگ وقت سے پہلے پہنچ گئے تھے۔ فیڈرل ڈائریکٹوریٹ کے افسران تمام ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ہدایت دے رہے تھے کہ وہ کس طرح باادب رہیں گے۔ انگریزی بولنے والی اُدھاری وائس پرنسپل لیٹ تھی۔ جس پر غیض وغضب کی لہر دوڑ رہی تھی۔ گیٹ کے پاس اکلوتا ایروکیریا کا پودا زمین میں لگنے کے لیے منتظر تھا، ذرا آگے بچے دف کے ساتھ خوبصورت سفید یونیفارم میں ملبوس کھڑے تھے۔ والدین کی مناسب تعداد کراقلی اور واسکٹ پہنے کھڑے تھی۔ کچھ مائیں بھی تھیں۔

اللہ اللہ کر کے سیکرٹری خزانہ آئے۔ زور زور سے دف بجایا گیا جونہی وہ پہنچے پہلے بچے کھڑے ہو گئے اور قومی ترانہ بجنے لگا۔ پھر تالیاں بجائی گئی جس کی ہدایت پہلے سے کی گئی تھی کی کس مقدار میں بجانی ہیں۔ سیکرٹری نے پہلے سائنس کی نمائش دیکھی پھر بچوں میں آئے اور ان کو مچھلی کی کہانی سنائی جس کا ترجمہ مہناز نے کیا۔ اس کہانی میں مساوات کا درس تھا، پھر سیکرٹری نے خطاب کیا اور بچوں کو بتایا کہ ان کی تین بیٹیاں ہیں اور بارہ پوتے پوتیاں ہیں۔ والدین کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ جیسے میں نے آپ کو کہانی سنائی آپ لوگ بھی سنیں اور سنائیں۔ جس پر ایک والد نے ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔

سیاسی تعلیم

سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد بائیں بازوں کے کچھ لوگ تو پاگل ہو گئے، کچھ نے اسلام قبول کر لیا، کچھ نے NGO میں پناہ لی اور کچھ مر گئے۔ مغربی قوتوں نے ان مہم جوؤں کو مصروف رکھنے کے لیے NGO کی بہت مالی امداد کی۔ NGO's نے طرح طرح کی ٹریننگیں مختلف تھری اور فور سٹار ہوٹلوں میں منعقد کیں۔ ایک وقت میں ایک ہوٹل میں تین، تین ٹریننگیں ہو رہی ہوتی تھیں۔ ہمارے لیے بڑا مشکل ہوتا تھا کہ کسی ٹریننگ میں جائیں اور کس ٹریننگ کو چھوڑ دیں۔ اگر ادارے کے تمام لوگوں کو کسی نہ کسی ٹریننگ پر بھیجیں تو پیچھے ادارہ کون چلائے گا۔ جس کا حل ہم نے یہ تلاش کیا کہ ایک ورکشاپی گروپ ترتیب دیا اور ہر جگہ اپنی حاضری برقرار رکھنے کے لیے ان کو ٹریننگ پر بھجوا دیتے تھے۔ ان ٹریننگوں میں ایک بہت سنجیدہ ٹریننگ پولیٹیکل ایجوکیشن پروگرام PEP تھا۔ جس کو عورت فاؤنڈیشن نے ترتیب دیا تھا۔ جس کی روح رواں عورت فاؤنڈیشن کی ڈائریکٹر نگار احمد تھی۔ اس میں تقریباً لفیٹ زدہ لوگ تھے، نہ صرف منتظمین میں بلکہ ٹریننگ کے شرکاء کی بھی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو لیفٹ کی سیاست کرتے تھے۔

شروع میں ہماری زیادہ گپ شپ ڈاکٹر چارلس امجد علی کے ساتھ رہی جو اس پروگرام کے ڈائریکٹر تھے بعد میں جب وہ چلے گئے اور زاہد اسلام ڈائریکٹر بنے تو ان کے ساتھ بہت سیکھنے کا موقع ملا۔

اس پروگرام کے ڈائزئن کے بارے میں تھوڑا سا بتا دوں۔ اس میں چاروں صوبوں سے سو کے قریب شرکاء تھے اور یہ ٹریننگ چاروں صوبوں میں ایک ایک بار رکھی گئی

اور اس کا دورانیہ تین سال کا تھا۔ ہم اکٹھے ہو کر کسی ایک مقام پر پانچ دن کے لیے رہتے اور مختلف دانشوروں سے مختلف موضوعات پر بات چیت سنتے۔ اس طرح نہ صرف ہم آپس میں پانچ دن کے لیے ایک دوسرے سے استفادہ کرتے بلکہ مختلف سیاسی زعماء سے پورا پورا دین سیکھتے۔ اس پروگرام کے ذریعے آئی اے رحمان، قیصر بنگالی، عمر اصغر خان، حنا جیلانی، ڈاکٹر اقبال، طارق بنوری، پروفیسر عزیز الدین سے نہ صرف ملاقات کا موقع ملا بلکہ گھنٹوں بحث مباحثے بھی کیے۔

ایک اور خوبی جو اس پروگرام کی بتانا چاہوں گا یہ تھی کہ ہمارا اپنا سیاسی شعور بہت مضبوط ہوا۔ خواتین کے حوالے سے رویے میں تبدیلی آئی جس کی وجہ سے میری بیوی نہ صرف میری جائیداد کی برابر کی حصّہ دار ہے بلکہ سیاسی اور سماجی کارکن بھی ہے اور جب ایک دفعہ اس نے وزٹ ویزے پر امریکہ جانا تھا تو اس کے والد اس کے حق میں نہیں تھے لیکن میں نے کہا کہ اسے دنیا دیکھنے دو اور وہ پاکستان سے اکیلی خاتون امریکہ کا دورہ کر کے آئی۔ اس کے بعد بنگال اور سری لنکا کے وزٹ کیے۔ اس طرح طلاق کا حق بھی اُس کے پاس ہے۔

پائیداری (SUSTAINABLIT)

پائیداری کا لفظ N G O میں بہت کثرت سے بولا جاتا ہے بلکہ بعض NGO نے اس نام کو اپنی NGO کے نام میں شامل کر لیا ہے اور بعض نے اس نام سے پراجیکٹ شروع کر دیئے۔ ہر پرپوزل میں اس کا ایک بیانیہ ہوتا ہے لیکن آج تک کوئی NGOs پائیدار نہیں ہوئی بلکہ ہمہ وقت مالی امداد کے درک میں رہتی ہیں۔

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے گزشتہ دنوں کنیڈین حکومت سے کہا کہ NGO's کی بجائے حکومت کو فنڈنگ دیں کیونکہ NGO کا ساٹھ فیصد مینجمنٹ میں لگ جاتا ہے۔ یہ درست ہے لیکن اس کے پیچھے محرکات ہیں۔

عام طور پر NGO's کی فنڈنگ بیرون ملک سے آتی ہے جن کے ساتھ قواعد وضوابط بھی باہر سے آتے ہیں۔ جن کے زیادہ تقاضے بیرونی حالات کے مطابق ہوتے ہیں اور یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ مقامی اداروں اور کمیونٹی میں تھوڑی بہت سرمایہ کاری کر کے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن شاید اس طرح ترقی یافتہ معاشرہ میں ہوتا ہوگا۔ ترقی پذیر ممالک میں ناممکن ہے جس کی وجہ سے فنڈنگ کے خاتمے کے ساتھ پراجیکٹ ختم ہو جاتا ہے۔

شعوری طور پر بعض NGOs اگر پائیدار ترقی کے لیے کچھ عملی اقدام کرتی ہیں اور ڈونر کی طرف سے پابندیاں شروع ہو جاتی ہے کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے اور ڈونر کی طرف سے جاری اخراجات میں حوصلہ افزائی کی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات کرایوں گاڑیوں اور سٹاف کی مد میں فنڈ مختص کر دیے جاتے ہیں جو ہر حالت میں NGOs کو

خرچ کرنے پڑتے ہیں جبکہ ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح وزیراعظم کی بات سچ ثابت ہوتی ہے کہ NGO's ساٹھ فیصد فنڈ مینجمنٹ میں خرچ کر دیتی ہیں۔

اس بات میں شک نہیں کہ NGO's نے جو منصوبے بہت کم فنڈنگ میں کیے ہیں وہ حکومتی ادارے دس گناہ زیادہ رقم میں کرتے ہیں اور پھر گزشتہ دہائی میں انسانی وسائل کی ترقی میں جو کردار NGO نے ادا کیا اور جو اتنا شاندار رہا کہ گزشتہ اور موجودہ کابینہ میں وزراء NGO's سیکٹر سے لیے گئے۔

راولپنڈی سے اسلام آباد تک کا سفر

جاڑے کی سردی نے مجھ سے موٹر سائیکل چھڑوا دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ پنڈی سے اسلام آباد بس یا ویگن کے ذریعے سفر کروں گا۔ جس کے لیے مجھے علی الصبح جاگنا پڑتا اور اپنے نرم گرم بستر کو چھوڑنا پڑتا۔ بغیر آہٹ کے دروازہ کھولنا چاہتا تاکہ میری بیوی سوئی رہے کیونکہ وہ رات کو دیر سے سوتی ہے۔ لیکن میری یہ خواہش پوری نہیں ہوتی اور میری بیوی جاگ جاتی ہے اور پھر مجھے زبردستی ناشتہ کرواتی ہے۔ گھر سے اڈے تک مجھے پندرہ سے بیس منٹ پیدل چلنا پڑتا ہے، جس کے لیے شارٹ کٹ راستوں سے تنگ کچی پکی گلیوں سے گزرتا ہوا اڈے تک پہنچتا ہوں۔ ان گلیوں میں دلچسپ منظر دیکھنے کو ملتے ہیں، کہیں کوئی حقہ تازہ کر رہا ہے تو کہیں کوئی اپنا تانگہ جوت رہا ہے۔ ایک شخص جس نے چادر پہنی ہوئی تھی اسی قسم کی چادر اس نے اپنے گدھے پر بھی ڈالی ہوئی تھی اور اس نے بالٹی میں تگھے پانی میں منہ دھویا اور بعد میں وہی پانی گدھے کو پلایا یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ نیلی قمیض اور سفید شلوار میں ملبوس سکول کی بچیاں بستے کے وزن سے ایک طرف جھکی ہوئی خراماں خراماں سکول کی طرف جارہی ہوتی ہیں۔

اڈے سے بس بھر جاتی مزدور بمعہ اپنے مزدوری کے سامان کہ ساتھ بس میں بیٹھ جاتے۔ کوئی پتیسہ بیچنے والا ہوتا تو کوئی کھدائی کرنے والا۔ اگلا سٹاپ چونکہ سبزی منڈی اور فروٹ منڈی کا ہے۔ لہٰذا وہاں طلباء کے ساتھ ساتھ فروٹ والے بھی سوار ہو جاتے ہیں۔ اکثر طلباء کرایہ نہیں دیتے جس پر بحث ہوتی رہتی اور چھوٹی موٹی جنگ بھی ہو جاتی ہے۔ یہاں سے بس اور ویگن ڈبل بھرنی شروع ہو جاتی ہے، ویگن میں تو لوگ

رکوع کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن بس میں صرف دربار جہانگیر کی طرح سر جھکانا پڑتا ہے۔

سقراط کہتا ہے کہ ریاست بھاری بھرکم جانور ہے جو آہستہ چلتا ہے اور میں وہ کاٹنے والی مکھی ہوں جو اسے تیز چلنے پر مجبور کرتا ہوں۔ مسافروں میں ایک آدھ ابتداء میں اسی مکھی کی طرح ہوتا ہے اور بعد میں باقی لوگ بھی حوصلہ پکڑ لیتے ہیں اور وقفے وقفے سے بس والوں کو کاٹتے رہتے ہیں کہ تیز چلو۔ لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور ہر سٹاپ سے سواریوں کو سوار کرتے ہیں اور آواز دیتے ہیں کے نال نال ہو جاؤ۔ ان کو ایسے پیک کرتے ہیں جیسے مٹھائی کے ڈبے میں رس گلے پیک کئے جاتے ہیں اور پھر ایک آواز آتی ہے ڈبل اے۔ اس کے بعد کرایہ لیا جاتا ہے۔ پہلے دن میں نے بڑی مشکل سے اپنا بٹوا نکالا اور اس میں سے سو کا نوٹ دیا جس کی واپسی بڑی مشکل سے ہوئی۔ اب میں ماہر ہو گیا ہوں اور ایک یا دو روپے کے سکے بس میں سوار ہونے سے پہلے اپنے ہاتھ میں رکھتا ہوں۔ میں نے برش، پالش، اپنی کنگھی، شیشہ دفتر میں رکھ لیا اور اب سوچ رہا ہوں کہ کپڑے بھی دفتر میں رکھ لوں کیونکہ ایک بین الاقوامی تنظیم کا ملازم ہوں۔ بس میں سفر کرنے کے بعد بندہ یوں ہوتا ہے جیسے چوسا ہوا آم۔ ایک دن عید کی چھٹیوں کے بعد ایک سٹاپ سے ایک نازک سی لڑکی نہایت خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے بالوں میں لال ربن لگائے اور کلف والے دوپٹے کے ساتھ بس میں سوار ہوئی اور وہ یوں لگ رہی تھی جیسا کہ 90 گرام کا سفید براق کڑاکے دار امپورٹڈ کاغذ، لیکن جب بس سے اتری تو یوں لگ رہی تھی جیسے اخبار میں کسی نے جلیبی کھا کر ہاتھ منہ پونچھ کر پھینکا ہو۔

پشاور موڑ پر تو سارے مزدور اتر جاتے ہیں اور کراچی کمپنی میں تو گاڑی بالکل خالی ہو جاتی ہے اور نئی سواریاں بیٹھنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہاں پر لوگوں کے لباس بھی

بدل جاتے ہیں اور ہاتھوں میں اوزار بھی ۔اب لوگ جینز پینٹ ،کوٹ والے ہوتے ہیں یا کم ازکم صاف ستھرے لباس پہنے ہوئے واسکٹ کے ساتھ جس میں لال سموسہ لگا ہوتا ہے ۔ ہاتھوں میں فائل ، ڈائیری یا ہینڈ بیگ ہوتا ہے ۔کنڈیکٹر کا لب ولہجہ بھی بدل جاتا ہے ۔اب سر اور جناب کا سابقہ لاحقہ استعمال ہونا شروع ہوجاتا ہے ۔لیکن یہاں بھی سواریوں کو اسی طرح پیک کرتے ہیں جتنے پروٹوکول سے پہلے پیک کرتے تھے ۔کچھ پروفیشنل سواریاں تازہ اخبار کو آٹھ دس تہہ لگا کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

پشاور موڑ سے پہلے تو لوگ زیادہ تر منڈی کے اتار چڑھاؤ پر بحث کرتے ہیں لیکن یہاں سے لوگ اپنے افسر کی اچھائیوں اور برائیوں کو زیر بحث لاتے ہیں ۔ بالخصوص ایڈمن والوں کو تو ضرور یاد کرتے ہیں ۔

دو گھنٹوں کے طویل پیدل اور گاڑی میں سفر کے بعد بالآخر میں اپنے دفتر پہنچ جاتا ہوں ۔حاضری لگا کر کبھی کبھار اپنے دفتر کی نئی ہنڈا کار میں فرنٹ سیٹ پر بیلٹ لگا کر واپس اسی جگہ آتا ہوں جہاں سے بس پر بیٹھتا ہوں ۔کیونکہ ہمارا فیلڈ ایریا وہی ہے ۔

ضامن کدہ

ہمارے کسان جدید ٹیکنالوجی سے ناواقف ہیں ۔ ریاستی سطح پر چند ادارے موجود ہیں جو کسانوں کو تکنیکی معاونت فراہم کرتے ہیں بلکہ چند ایک تو گرانٹ بھی دیتے ہیں لیکن ان تک عام کسان کی پہنچ نہیں ہے ۔جس کے لیے ضروری ہے کہ کسان کے قریب ایسی تجربہ گاہ ہو جہاں پر جدید بیج مشینری ،ٹیکنالوجی موجود ہو ۔جو اس کی فصل کو بہتر کرے ۔ بیماریوں سے بچائے اور اچھے دام وصول ہوں ۔

ہماری تحقیق کے مطابق کسان کی فصل کی آمدن کا بڑا حصہ یا تو ٹرانسپورٹر لے جاتا ہے یا آڑھتی کو ملتا ہے جو بچ جاتا ہے وہ بیماریوں اور آفات کی نذر ہو جاتا ہے ۔

مندرجہ بالا تمام معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے ضامن کدہ کی بنیاد رکھی جس کے لیے چار ایکڑ زمین اس رقم سے خریدی جو یو این نے انعام میں ہمیں دی تھی ۔

اس وقت تک ہم نے صرف زمین خریدنے ،اس پر پانی کی فراہمی اور کمروں کی تعمیر میں کامیابی حاصل کی ہے ۔مستقبل میں ایک ٹریننگ سینٹر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں جہاں پر کسانوں اور ان کے بچوں کے لیے تربیت گاہ اور تجربہ گاہ بنے گی ۔ جہاں پر قرضے ، بیج ، پودے ، اوزار اور جانور کسانوں کو دینے کے لیے دستیاب ہوں گے ۔تمام کسانوں کو ٹنل فارمنگ کے لیے رہنمائی کے لیئے فش فارمنگ ، پولٹری و لائیوسٹاک فارمنگ کے کورس کروائے جائیں گے ۔

ان کے مال کی منڈی تک رسائی کے بجائے براہ راست عوام تک رسائی کے طریقوں پر غور کیا جائے گا۔ قدرتی کھادوں سے اشیا کی پیداوار ممکن بنائی جائے گی جس کے لیے قریبی شہروں کا کوڑا قابل استعمال بنایا جائے گا۔

ضامن کدہ اس وقت ایک خواب ہے لیکن اگلے دس، بیس سال میں یہ ایک حقیقت بن جائے گا۔

امریکی یاترا

مجھے اس پروگرام میں مہناز نے بھجوایا۔ میں چاہتا ہوں کہ امریکہ میں موجود اداروں کا تجربہ آپ لوگوں تک پہنچاؤں۔ میں نے روزانہ کے معمولات پر مشتمل پروگرام کو قلم بند کیا ہے جس کی تفصیل تاریخ وار پیش خدمت ہے۔

21-6-02

21۔ جون بروز جمعہ شام 6-00 بجے لنڈا کے گھر الوداعی چائے تھی جس میں امریکی ایمبسی کے لوگ ہمارا 14 کے گروپ، بیلا جمیل اور مہناز اکبر نے شرکت کی۔ سب لوگوں نے اکٹھی چائے پی اور آخر میں وفاقی وزیر زبیدہ جلال اور دیگر افراد کی الوداعی باتیں سنیں۔

اسی شام کو ہم ائیرپورٹ روانہ ہوئے۔ ٹکٹ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں بہت دیر ائیرپورٹ کے باہر رکنا پڑا۔ بنیادی طور پر مسئلہ یہ تھا کہ جہاں سے جہاز تبدیل کرنا تھا وہاں تین گھنٹے وقفہ درکار تھا جبکہ ہمارے پاس آدھا ٹائم تھا۔ بڑی منت سماجت کے بعد اور آخری وقت میں جہاز پر سوار ہو گئے۔ لاہور اور پھر ابوظہبی پہنچ گئے۔ ابوظہبی میں ایک اور مسئلہ درپیش آیا کہ کچھ لوگوں کے پاس ٹکٹ امارات کا تھا اور کچھ کے پاس برٹش ائیرویز کا۔ ان سب کو جدوجہد کے بعد یکجا کیا گیا۔ ابوظہبی ائیرپورٹ بہت شاندار تھا۔ مختلف ممالک کے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔

برٹش ائیرویز میں سورج کے پیچھے پیچھے ہم لندن کی طرف جا رہے تھے اور لندن کے قریب سورج کو پکڑ لیا۔

22-6-02

اس دن صبح ہم لندن پہنچ گئے اور یہاں کا ائیرپورٹ بھی وسیع وعریض اور شاندار تھا۔ دوپہر کو ایک بار پھر سورج کے تعاقب میں بوسٹن کے لیے روانہ ہو گئے اور اس مرتبہ ہم امریکی ائیرلائنز میں سوار ہوئے۔ آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم مقامی وقت کے مطابق 2 بجے امریکہ کی ریاست بوسٹن پہنچ گئے۔ یہاں پر سخت چیکنگ اور ائیرپورٹ سیکورٹی اور امیگریشن کے مراحل سے گزرنا پڑا جس میں کافی وقت لگ گیا اور ہمارا جہاز چھوٹ گیا۔ پھر ہمیں دوبارہ ٹکٹ میں ردوبدل کروانا پڑا اور ہم سخت سیکورٹی چیکنگ کے بعد مقامی جہاز میں بیٹھ گئے اور امریکی ریاست فلاڈلفیا پہنچ گئے۔ ائیرپورٹ پر دو خواتین کافی وقت سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں جیکی اور پیٹی بدقسمتی سے ہمارے چند ساتھیوں کا سوٹ کیس کھو گیا جس سے پریشانی میں اضافہ ہوا۔

تمام لوگ مسلسل تیس گھنٹے کے سفر کے بعد تھکے ہارے فلاڈلفیا کے تاریخی شہر کے ایک بارونق ہوٹل میں پہنچ گئے اور اپنے اپنے کمروں میں سو گئے۔

23-6-02

صبح دیر تک لوگوں نے آرام کیا اور 12 بجے کچھ تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے نکل گئے جس میں انڈی پنڈنٹ نیشنل ہسٹاریکل میوزیم کا ایریا دیکھا۔ وہاں ایک میوزیم، ڈاک خانہ اور چھاپہ خانہ جو کہ آزادی کے وقت بنائے گئے تھے وزٹ کیے گئے۔

چند ایسی چیزیں دیکھیں جو اب بھی پاکستان میں ہو رہی ہیں جن میں سے میوزیم میں رکھے ہوئے دو سو سال پرانے بڑھئی کے اوزار دیکھے جو اس وقت بھی عام استعمال ہو رہے ہیں۔ تانگہ گھوڑا روڈ پر استعمال ہوتے دیکھا۔ چھاپہ خانہ دیکھا۔ جو آج بھی ایسے ہی پاکستان میں کام کر رہا ہے۔

ایک خاص چیز دیکھی کہ چند بچے عورتیں اور نوجوان بندوق کی طرز کی لکڑی کے ڈنڈے اٹھائے انگریز فوج کی نقل کر رہے تھے اور ایک شخص ان کو کمانڈ دے رہا تھا اور اس طرح جنگی آزادی کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ آخر میں ایک چرچ میں گئے جس میں پادری وعظ و نصیحت کر رہے تھے اور چندے کے لیے بکس رکھا ہوا تھا بعد میں ہم ایک شاپنگ سینٹر میں گئے جس میں اسی طرح ریڑھیوں پر مال لدا ہوا تھا جیسے ہمارے ہاں نظر آتا ہے۔

24-6-02

IVC کے میزبانوں نے ہمیں ناشتہ پر خوش آمدید کہا جو ایک عمارت کی اٹھارویں منزل میں تھا۔ تنظیم کی صدر Nancy J.Gilgog نے رسمی جملے ادا کیے پھر ذرا لیٹ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی آفیسر Alicr Kenitance، Colleesi Nancy نے پروگرام پر بات چیت کی۔ ہمیں زادِ راہ کے متعلق بتایا اور صحت کی انشورنس کا کارڈ بھی دیا جس پر اگر ہم بیمار ہو جائیں تو پچاس ہزار ڈالر تک کا علاج مفت ہو سکتا ہے۔ ایسے کارڈ بھی دیے جس کی بدولت ہم ملکی مہمان ٹھہرے اور خصوصی اہمیت کے حامل سٹکر بھی دیے۔ دوپہر کے کھانے پر ایک ہوٹل میں گئے اور کھانا بھی IVC کی طرف سے تھا۔ بعد دوپہر یونیورسٹی (Pennsylvenia) گئے جہاں پر نائب صدر، چیف آف سٹاف نیسلوانیا سے ملاقات ہوئی جنھوں نے بتایا کہ فلاڈلفیا میں کس طرح تعلیمی اداروں

کی تقسیم ہے اور یہ ان کے سکولوں اور پرائیویٹ سکولوں میں کیا ہو رہا ہے۔انھوں نے بتایا کہ پرائیویٹ سکول زیادہ تر مشنری ہیں اور زیادہ مہنگے ہیں نسبتاً گورنمنٹ سکولوں کے۔

شام کو فلم دیکھنے گئے جہاں پر لوگ قطار میں کھڑے تھے اور ہماری گائیڈ نے دیسی طریقے سے یعنی اضافی رقم ادا کر کے ٹکٹ حاصل کیے اور ہم نے انگریزی فلم دیکھی۔ یہاں پر ایک ہی ہال میں الگ الگ بے شمار سینما گھر تھے جس میں مرضی چلے جائیں۔

25-6-02

آج صبح ہم لوگ فری تھے رابرٹ کے ساتھ میوزیم دیکھنے کا پروگرام بنایا لیکن وہ صبح نہیں آئے۔لہذا اشوک اور نثار کے ساتھ فلش نامی بس میں بیٹھ گئے جس نے چار ڈالر میں ہمیں پورے شہر کی سیر کرائی۔بس کا ڈرائیور گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ اہم مقامات کے بارے میں کمنٹری بھی کر رہا تھا۔آخر میں ہم سٹی ہال میں اتر گئے اور مجسموں کے ساتھ تصاویر بنوائیں۔

دوپہر میں ٹمپل یونیورسٹی گئے جہاں پر جان مینگ (Goan Manng) جو کہ یونیورسٹی کی سربراہ ہیں انھوں نے بریفنگ دی اور مرکزی رہائشی اور مقامی حکومت کے رول کے بارے میں بتایا۔انھوں نے نیشنل ڈیفنس ایکٹ 1950 غربت کے خلاف جہاد 1960ء نیشنل کمیشن ایکلنس 1980 گول 2000 امریکی تعلیمی ایکٹ 1990 اور No Child Left benh Act 2001 کے بارے میں بتایا۔

سوال و جواب کے دوران جو گروپ کے ساتھیوں نے پاکستان میں تعلیم کو درپیش چیلنج بیان کیے تو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے کہا کہ یوں لگتا ہے کہ آپ فلاڈلفیا

کے اڑوس پڑوس کی کسی ریاست کے مسائل بیان کر رہے ہیں کیونکہ اسی طرح کے مسائل ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ریاستوں کو بھی درپیش ہیں۔انھوں نے والدین کی دلچسپی بچوں کی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں میں بتائی۔یہ بھی بتایا کہ پچاس فیصد بچے تعلیم چھوڑ جاتے ہیں۔

26-6-02

آج صبح فلاڈلفیا ایجوکیشن فنڈ کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر نینسی نے ایجوکیشن فنڈز پر ہمیں بتایا کہ زیادہ تر تعلیمی فنڈ جو ہے وہ پراپرٹی ٹیکس سے آتا ہے اور سٹیٹ ٹیکس سے بھی آتا ہے۔انھوں نے بتایا کہ قومی سطح پر کوئی نصاب نہیں ہے۔مقامی سٹیٹ ہی اس کی ذمہ دار ہے کہ وہ تنخواہیں اور نصاب کو مقرر کریں۔وفاقی حکومت جو مد تعلیم میں فراہم کرتی ہے وہ غربت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔نیسلوانیا میں ٹوٹل 501 سکول ڈسٹرکٹ ہیں اور ہر ڈسٹرکٹ میں سکول بورڈ ہے جس کا رول ہے کہ ریونیو اکٹھا کرے پالیسی بنائے، تعیناتی کرے۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ 97.98 میں 5 سے 6 ہزار ڈالر ہر طالب علم پر ہر سال میں خرچ کرتی ہے۔

اس کے بعد ایک اور تنظیم فلاڈلفیا ہیٹرن چلڈرن اینڈ یوکو پالیسی نے بچوں اور نوجوانوں کے مسائل پر روشنی ڈالی کہ ان کی آواز سنی نہیں جا رہی تھی۔ہم نے ان کی آواز بلند کرنے اور حقوق کی جدوجہد کے لیے ایک تنظیم بنائی۔

دوپہر میں ہم لوگ ایک مارکیٹ میں گئے جہاں پر دنیا بھر کی خوراکیں موجود تھیں۔شام کو فلاڈلفیا کے ڈپٹی میئر مارک سے ملاقات ہوئی اور وہ سیاسیات کے استاد

بھی تھے اور انھوں نے فیڈریشن اور کنفڈریشن کے بارے میں مضمرات اور فائدے ہمیں بتائے۔ اگرچہ پروگرام پہلے سے شیڈول میں نہیں تھا لیکن اچانک ہمیں کنفڈریشن پڑھانے کا فیصلہ کیا گیا۔

27-06-02

آج صبح پروگرام کے مطابق CPRE گئے۔ جہاں پر چار لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے اور انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ پانچ یورنیوسٹیوں میں پالیسی ریسرچ کا کام کر رہے ہیں پہلے شام اور بعد میں جان نے بات کی۔

دو پہر میں ہم لوگ واپس اپنے ہوٹل آ گئے۔ جہاں پر کھانے کے بعد دو بجے نکلنا تھا جہاں سے ایک اور ریاست نارتھ ریجن RALEIGH کے لیے نکلنا تھا۔

ائیر پورٹ پر ہمارا تمام سامان چیک کیا گیا بعد میں ہمیں دو جگہ سخت چیکنگ سے گزرنا پڑا۔ بہرحال جہاز سے سفر شروع ہوا فیلڈیفیاء سے جب پرواز کی تو ارد گرد کھیت اور ان میں گھر نظر آئے۔ نارتھ کیرولینا جب ہم پہنچے تو یہ فلاڈلفیا سے بالکل مختلف تھا نہ تو بلند بالا عمارتیں تھیں اور نہ ہی گنجان یہ سبزہ ہی سبزہ تھا اور درخت ہی درخت تھے کہیں کہیں درختوں میں گھر بنے ہوئے تھے بالکل ایک طرح کے۔ ائیر پورٹ پر ہمارے ایک ساتھی کا بیگ ٹوٹ گیا اور ایک کا گم ہو گیا۔ جس کو کلیم کرنے میں وقت لگا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ بالآخر ہم نے راستے میں کچھ کھانے پینے کا سامان لیا کیونکہ گائیڈ بتا رہے تھے کہ اس وقت شہر میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ملے گا۔ ایک آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ہوٹل پہنچ گئے جہاں پر ہمیں نیا پروگرام اگلے پانچ دن کے لیے مل گیا۔

28-6-02

پہلے ٹائم ہم لوگ NG Department of Public گئے۔ جہاں پر چار لوگوں نے پروگرام کے بارے میں بات کی اور تفصیل سے چارٹر سکولوں کے بارے میں بتایا جو کہ لیڈرشپ ٹیکنیکل مدد فراہم کرتے ہیں اور انھوں نے کس طرح چارٹر سکول بنائے۔

اس دوران آخر میں ہمارے ادھے ساتھی جو کہ فلاڈلفیا سے پرواز منسوخ ہونے کی وجہ سے رات کو نہیں پہنچ سکے آخر میں آ گئے۔ شام کو ISP میں گئے جہاں پر مس مارٹی نے ہمیں ویلکم کیا یہ دفتر ایک روایت کو برقرار رکھتے ہوئے لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم پارٹنرشپ کس طرح کر رہے ہیں اور کس طرح لوگوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور گزشتہ دنوں یہاں اساتذہ نے وزٹ کیا۔ میٹنگ کے بعد لوگ شاپنگ پلازہ میں گئے اور مختلف لوگوں نے مختلف اشیاء خریدی

29-6-02

نیچرل سائنسز میوزیم کو دیکھا جو کہ قدرتی مناظر پیش کر رہا تھا۔ کہیں پر جنگل کی صورتحال تو کہیں ساحل سمندر کے مناظر۔ تفصیلات کے لیے چھوٹے چھوٹے نوٹ، فلمیں جو فوری دیکھی جا سکتی تھی۔ اور کمپیوٹر کی مدد سے حاصل ہونے والی معلومات دستیاب تھی۔ بعد میں آرٹ پلس گئے جہاں پرنٹنگ کے لیے جگہ تھی اور مختلف تصاویر دلکش انداز سے بنائی گئی تھی اور مختلف خواتین تصاویر کشی کی سرگرمی میں مصروف تھی۔

شام کو دو یورنیورسٹیوں کا دیدار باہر سے کیا۔ جس میں ایک پبلک یورنیورسٹی

نارتھ کیرولینا اور دوسری ڈیوک یونیورسٹی تھی۔ ڈیوک یونیورسٹی ایک خاندان کے نام پر قائم کی گئی ہے جس کی وارثہ سارہ ڈیوک نے اس رقم سے یہ یونیورسٹی بنائی۔ یہ یونیورسٹی خاصی مہنگی ہے۔ ہم جب اس یونیورسٹی پہنچے تو سابق طالب علموں کی شادی تھی جبکہ اس کے باغ میں ایک اور شادی ہو رہی تھی دولہا دلہن ایک فوکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

رات کے وقت ہم ایک مارکیٹ گئے جہاں پر سینکڑوں دوکانیں تھی۔ جس میں الیکٹرونکس، گارمنٹس، ڈیکوریشن، جوتے وغیرہ سب موجود تھے۔ جو کہ ہمارے ملک کے مقابلے میں کئی گنا مہنگے تھے۔ ہم لوگ کسی چیز کا ریٹ معلوم کرتے اور اس کو پاکستانی روپوں سے ضرب دیتے اور چھوڑ دیتے۔ ایک مثال میں دیتا ہوں کہ جو بوٹ میں نے پاکستان سے چار سو میں لیے تھے وہ یہاں چھ ہزار میں فروخت ہو رہے تھے جس سے ہمارے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا کہ کیوں نہ ہم اپنے کپڑے، جوتے یہاں فروخت کر دیں۔ پھر ایک اور خیال آیا کیوں پاکستان سے اشیاء یہی بھیجی جائیں اور اپنی NGO کے لیے کمائی کا راستہ نکالیں۔

30-6-02

صبح ہم لوگ حسب معمول اپنے پروگرام سے شہر کو دیکھنے کے لیے نکلے چونکہ اتوار کا دن تھا لوگ دیر تک سو رہے تھے اور سڑک سنسان تھی ہم لوگ گورنر ہاؤس کو دیکھنے کے لیے نکلے تھے لیکن پہنچ نہیں سکے بالآخر ایک قبرستان میں ستا کر واپس آ گئے۔

شام کو ایک کھانے پر مدعو تھے جو کہ ایک مقامی خاندان کارل رائٹ نے ہمارے لیے آرگنائز کیا تھا۔ ہماری میزبان ہمیں بروقت ہمارے ہوٹل اپنی کار میں لینے

آ گئی اور ہم پانچ مرد اور دو خواتین ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ہوٹل سے 15 منٹ کے گاڑی کے فاصلے پر ہم ان کے گھر پہنچے۔ جہاں پر ان کے خاوند نے ہمیں ویلکم کیا۔ گھر چھوٹا سا تھا لیکن اس میں آسائشوں کی ہر چیز موجود تھی۔ ہم کمرے میں گئے اس کے بعد سویمنگ پول پر گئے جس کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم تمام ساتھی ان پر بیٹھ گئے کچھ ہلکی پھلکی کھانے کی چیزیں دی گئی۔ سوائے دو افراد کے باقی نے جوس اور مشروبات وغیرہ لی کچھ دیر بعد ہمیں قریب پڑے ہوئے مسل کو آرام دینے والے پانی کی ٹینکی دیکھائی گئی۔ اس کے بعد سوئمنگ پول کے دوسرے کنارہ پڑے باربی کیو گرل کے گرد گئے اور قیمے کے کباب رابٹ گیلی نے بنائے۔ کافی دیر گفت وشنید اور خوبصورت ڈنر کے بعد ہمیں رابرٹ گیلی اپنے ڈائزئنگ روم میں لے گیا جہاں پر ہارٹ سرجری سے لیکر ٹریکٹر اور کمپیوٹر کے ڈائزن تک وہ کرتے تھے۔ کچھ ماسک گڑیا اور دیگر اشیاء ڈائزئن کی اور اس کے لیے وہ 25 ڈالر فی گھنٹہ ان کمپنیوں سے معاوضہ لیتے جس کے لیے وہ کام کرتے۔ ان کے گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا سارے کام وہ خود کرتے تھے اور بہت صاف ستھرا اور تمام سہولیات سے آراستہ دفتر تھا۔ جبکہ کمپیوٹر، فیکس اور فوٹو سٹیٹ مشین بھی گھر پر موجود تھی آخر میں تحائف کا تبادلہ ہوا اور انھوں نے پیس آئین امریکہ کی کاپی تحفے میں دی جبکہ ہمارے ساتھیوں نے مختلف اشیاء ان کو تحفے میں دیں۔

1-7-02

آج صبح POC Montessori Magnet School گئے جہاں پر ایک ٹیچر نے ہمیں بریفنگ دی اس نے پہلے ایک وڈیو فلم دیکھائی جس میں بچوں کی کلاس روم کی سرگرمیوں، بلاک کارنز، سٹوریاں، کلرٹی وی، اور انفرادی گروہ کی بچوں کی سرگرمیاں

دکھائی گئیں۔ چونکہ گرمیوں کی چھٹیاں تھی ہم ان کا چلتا ہوا سکول نہ دیکھ سکے۔ کمرے اور لائبریری وغیرہ دیکھی جو کہ انتہائی شاندار تھی۔ جن کا تصور ہمارے ہاں بڑے سکول بھی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے بتایا کہ بچے جو بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں ہم اسی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور ہمارے کلاس روم میں چار، پانچ سال کے بچے ایک کلاس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور نرسری کی فیس والدین برداشت کرتے ہیں جبکہ بڑی کلاسوں کی فیس نہیں ہے۔

نرسری کی فیس سالانہ چار ہزار روپے بن جاتی ہے۔ سکول خود اپنا نصاب بناتا ہے۔ ہر کلاس میں ٹیچر کے ساتھ اسسٹنٹ ٹیچر بھی ہوتی ہے اور ڈسٹرکٹ میں بھی ٹریننگ ہوتی ہے جن کو باقائدہ ٹیچنگ کا سرٹیفکیٹ مل جائے انھیں ہم نمبر دیتے ہیں۔ ڈراپ آؤٹ بہت کم ہے۔ بڑی کلاس اکٹھی بھی بیٹھتی ہیں اور سینئر بچے چھوٹوں کی مدد کرتے ہیں۔

گیارہ بجے Exlorius گئے جو کہ دنیا کے متعلق ایک میوزیم ہے۔ جہاں دنیا بھر سے جو بھی کوئی وزٹ کرنے آتے ہیں وہ اپنے ملک کی اشیاء یا روایتی چیزیں لاتے ہیں جن کو مختلف شوکیسوں میں نمائش کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ہم نے مختلف ممالک کی چیزیں اس میوزیم میں دیکھیں یہ میوزیم ایک این جی او کے تحت چل رہا تھا جن کا ایک گھر اور ایک سکول بھی تھا۔ ہماری میزبان نے ہمیں اس کے متعلق تمام باتیں بتائی اور توقع کی کہ ہم بھی اس میوزیم کے لیے کوئی چیز ارسال کریں گے۔ دوپہر میں RALEIGH CHARTER HIGH SCHOOL گئے جو کہ پہلے ایک انڈسٹری تھی لیکن اب وہ چارٹر سکول میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ جس کی کچھ دیواریں پرانی اور کچھ نئی تھیں۔ یہ نویں، دسویں اور بارہویں جماعت کے لیے بنایا گیا سکول تھا جس میں سائنس لیبارٹری،

کمپیوٹر لیب اور دیگر تمام آسائشیں موجود تھیں۔

سکول کے پرنسپل نے ہمیں بتایا کہ یہ چارٹر سکول ہے جو کہ مقامی لوگ اپنی مدد آپ کے تحت چلانا چاہتے ہیں جبکہ پہلے غیر سرکاری تنظیمیں کی ساکھ، مالی پوزیشن اور گورننگ بورڈ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ جس میں سٹیٹ، ڈسٹرکٹ سے جو فنڈ آتے ہیں وہ ریگولر آتے ہیں۔ باقی مقامی سطح پر اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ یہ عوام کے لیے مفت ہے۔ 45 منٹ کی کلاس میں بچوں کو ریفریشمنٹ بھی دیا جاتا ہے۔ ٹیچر کے ساتھ ایک سال کا معاہدہ ہوتا ہے اور بورڈ جسے چاہے رکھے اور جسے چاہے نکال سکتا ہے۔ ہمارے سکول میں چار، پانچ Phd اساتذہ میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔ جسے PASTA کا نام دیا جاتا ہے۔ جس میں والدین، سرگرم افراد، طالب علم اور اساتذہ ہوتے ہیں۔ والدین سکولوں کی سرگرمیوں اور ترقیاتی پڑھائی کے معاملات میں مدد کرتے ہیں جس کی ہر سہ ماہی میں میٹنگ ہوتی ہے۔

شام کو فرنیکلن اکیڈمی گئے جہاں کی بلڈنگ بہت شاندار اور نئے فرنیچر سے آراستہ تھی جس میں کمپیوٹر لیب وغیرہ موجود تھے۔ اس کی ایڈمنسٹریٹر نے بتایا کہ ہمارے ہاں پرنسپل کا تصور نہیں ہے۔ دو بلاک ہیں۔ اوسطاً گیارہ سٹوڈنٹ کے لیے ایک ٹیچر ہے۔ ٹیچر کنٹریکٹ پر ہیں اور پارٹ ٹائم بھی ہیں۔ چارٹر سکول کا ایک اپنا سیلری پیکج ہوتا ہے۔

2-7-02

صبح دیر تک سوئے رہے کیونکہ آج اس شہر کو دوپہر میں الوادع کرنا تھا اس لیے کوئی اور سرگرمی نہیں تھی۔ پہلے ہی سے ہمیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پٹی جو کہ عمر

رسیدہ ہماری گائیڈتھی بار بارہمیں اپنے گروپ کے رنگ یاد کروارہی تھی ۔بنیادی طور پر ہمارے ساتھ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ذہین لوگ تھے۔جیکی،رابرٹ اور پیٹی۔جیکی خاموش طبیت اورخوش اخلاق تھی ۔باقی دو بہت زیادہ ہدایت کاراور باتونی تھے ۔ہمارے گروپ میں زیادہ تر لوگ خاموش طبع تھے اورہمیں گائیڈبھی جیکی مل گئی۔

گنتی شروع ہوئی بندوں اوربکسوں کی ،سامان بس میں رکھ دیا گیا اورلوگ بھی سوار ہو گئے ۔ائیر پورٹ آدھے گھنٹے کے بعد پہنچے۔ ہماراڈرائیورسیاہ فام تھا۔اور مسلسل اپنے گشتی فون پر باتیں کرر ہا تھا۔پیٹی کی آخری ہدایت کے بعد ہم اللہ اللہ کر کے جوہ ہو گئے اوردوسرے پلیٹ فارم پر چلے گئے جہاں پرایک مرد نے ہمارے پاسپورٹ اورٹکٹ چیک کیےاورہمیں سامان کے ساتھ اندر لے گیا۔اس نے ایک کاونٹر کے سامنے کھڑا کر دیا ۔دوخواتین نے ہمارے ٹکٹ لیکرہمیں جہاز کا اجازت نامہ (بورڈنگ کارڈ)اورسامان کے لیے رسیدیں دیں۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ بغیر چیکنگ کہ داخل ہو جائیں گے ۔لیکن ہماری مایوسی اس وقت بڑھ گئی جب ہمیں لے جا کرایک اورکاؤنٹر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اپنا سامان یہاں چیک کروائیں ہم دیکھ رہے تھے کہ کالے گوروں سب کا سامان ایک ایک کپڑا بیگ سے نکال کر چیک کرر ہے تھے۔ کیونکہ ایک دن قبل اخباری خبر تھی کہ ائیر پورٹ سکیورٹی درست نہیں ہے کیونکہ حکومتی بندوں نے ماڈل ہتھیار اور بم وغیرہ گزار دیئے تھے ۔لہٰذا سکیورٹی مزید سخت کر دی گئی ۔ ہماری خواتین کی بناؤ سنگھار کی اشیاء کے ڈھکن بھی کھول کھول کرسونگھ رہے تھے اور بڑے سلیقے اورمہذب طریقے سے الگ رکھ رہے تھے بالآخر ایک صبر آزما چیکنگ کے بعد میں نے اپنا سامان چیک کروالیا اور باقی ساتھیوں کے انتظار میں سامنے قطار میں مستقل لگی ہوئی کرسیوں پراپنی گائیڈ جیکی کے

ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی ۔میں نے اپنے دستی بیگ سے اپنا کھانا نکالا جو کہ پیٹی کی ہدایت کے مطابق ہم نے صبح ہی سے ایک چینی ہوٹل سے خریدا تھا۔ میں نے اپنا کھانا ادھا ہی نگلا تھا کہ آخری ساتھی کا بیگ چیک ہوگیا تھااوراس پر سندری رنگ کی ٹکیہ لگا کر ایک موٹا سکیورٹی اہلکار باریک لکیر دار داڑھی والا آدمی حوالہ جہاز کرنے لے جا رہا تھا۔ہم سیڑھیوں کی طرف دوڑے برقی سیڑھیوں کے قریب ایک مرد اورعورت نے ہمارا ٹکٹ چیک کیا اورہم آگے بڑھ گئے ۔ جب اوپر پہنچے تو پھر ایک چیکنگ کے عمل سے گزرے اور ہمارا دستی سامان شفاف نظر آنے والی مشین سے گزارا گیا اورہمیں برقی آلہ سے چیک کیا گیا۔جس کے لیے جیبوں کو خالی کرنا پڑتا ہے۔اور ہاتھوں کو ہوائی جہاز کے پروں کی طرح پھیلانا پڑتا ہے ۔بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ جہاز میں سوار کرنے سے پہلے ہمیں جہاز بنایا جا رہا ہے۔ہم انتظار گاہ تک پہنچے جہاز میں تھوڑا وقت باقی تھا۔ ہمارے بیگ ، جوتے اور پرس اورجسم ایک مرتبہ پھر چار لوگوں نے چیک کیے اس دوران ہماری گائیڈ جیکی ہمیں دیکھتی رہتی اور ہماری اوراپنی بے بسی پر ترس کھاتی رہتی ۔اگر چہ ان بیچاروں نے تو ہمارے لیے خصوصی خطوط بھی بنائے تھے لیکن امریکی ہیں کہ ایک قدم بغیر چیکنگ کے اٹھانے نہیں دیتے۔ اللہ اللہ کر کے جہاز میں داخل ہوئے ٹائم ہو گیا۔اعلان ہوا کہ موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے کچھ دیر ہو جائے گی ۔کینسل ہونے کے بھی چانس تھے۔ ساتھیوں کے چہرے زرد ہو گئے کہ اتنی چیکنگ کے بعد ہم اپنے سفر پر روانہ نہ ہو سکیں گے۔ ہم رات جہاز میں ہی گزاریں گے لیکن واپس نہیں جائیں گے۔تسکین نے نفل پڑھنا شروع کر دیئے ۔اعلان ہوا بیلٹ باندھ لیں روانگی کے لیے تیار ہو جائیں ۔ سب کی جان میں جان آئی ۔ جہاز نے پرواز شروع کی کچھ دیر بعد اترنا شروع ہوا راستے میں ایک جگہ رو کنا تھا۔کچھ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ یہاں بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں ائیر پورٹ

گھومتے ہیں۔ باہر گئے گھومنے، پھر جب داخل ہونے لگے تو پھر چیکنگ کی گئی پرس بھی، جیب بھی، ٹانگیں بھی، شلواریں بھی، پینٹیں بھی، کوٹ بھی۔

جہاز میں پھر اعلان ہوا بارش ہو رہی ہے کچھ دیر مزید رکنا پڑے گا۔ ڈاکٹر جتوئی نے کہا آیت کریمہ پڑھوانا پڑے گا۔ ہمارے جہاز کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ کافی انتظار کے بعد جہاز چل پڑا اور ہم کنٹکی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔

ہماری میزبان یہاں ہمارا انتظار کر رہی تھی گول چہرے، کٹے سرُخ بالوں والی، دیدہ زیب اور جوان روتھ مئیرس نے ہمیں کنٹکی ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہا ہم اپنے وزن سے زیادہ وزنی سامان کو ٹرالیوں میں رکھ کر اپنے میزبان کے پیچھے چل پڑے۔ وہ ایک ویگن نما گاڑی لائی تھی جس میں ہم نے زبردستی اپنا سامان ٹھونسا اور خود بھی بیٹھ گئے۔

تھوڑے سفر کے بعد ہم پہلے سے بُک شدہ ہوٹل پہنچ گئے جو کنٹکی کے دریا کے کنارے بلند بالا عمارت میں تھا۔ ہماری میزبان نے مختلف جگہوں کے بارے میں ہمیں معلومات دیں لیکن چیکنگ اور جہاز کی تھکاوٹ کی وجہ سے کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔

ہوٹل بہت عالیشان تھا لیکن امریکہ بھر سے نابینا حضرات وخواتین اپنے کتوں اور سفید چھڑیوں کے ساتھ اس ہوٹل میں گھوم رہے تھے۔ یہاں ہمارے کچھ ساتھی کتوں سے ڈر گئے تھے اور کچھ پیار کرتے تھے۔ کچھ خوش ہوئے کہ رہائش کے ساتھ کتے بھی مل گئے اور کچھ ناراض کہ کتوں کے ساتھ رہائش ملی۔ بہر حال کمروں میں پہنچے تو اپارٹمنٹ تھے ایک ایک اپارٹمنٹ میں دو بیڈ روم، TV لاؤنج، ڈائننگ ٹیبل، کچن اور کچن میں فریج، اون، ٹوسٹر، برتن جیسے پورا نیا گھر تھا اور لاؤنج کے سامنے دریا اور خوبصورت پلوں اور کشتیوں کا نظارہ۔ ساتھیوں کی تھکاوٹ اور کتوں کی شکایت دور ہوگئی۔ فیصلہ ہوا کہ رات کو

اکٹھا شہر گھومنے جائیں گے اور کتوں کے بغیر کھانا کھایا جائے گا اور فیصلہ بھی لیڈر کا تھا ہم نے بھی فیصلہ مانا اور خواتین کی قیادت میں پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ہم نے مختلف ریسٹورنٹ سونگھے لیکن وہاں کھانا کہیں نہیں تھا۔ بلکہ جام چل رہے تھے۔ بالآخر ایک بگھی والے سے ڈاکٹر ہارونہ نے پوچھا اس نے بتایا کہ ناک کی سیدھ پر چلو ایک فاسٹ فوڈ آئے گا۔ کھانا کھا لینا۔ لوگ تھکے ہارے چل رہے تھے۔ بالآخر ہم نے وہ جگہ ڈھونڈ لی جس کی تلاش تھی اور بونیل برگر خریدی اور کھائی۔ واپسی میں لڑکھڑاتے ہوئے جام دیکھتے دکھاتے ہم کتوں کی محفل سے گزرتے ہوئے اپنے محل میں پہنچے اور لمبی تان کر سو گئے۔

3-7-02

ہماری میزبان ہمیں ہوٹل میں ساڑھے نو بجے لینے آ گئی اور ہم لوگ اپنے کمروں سے نکلے اور کتوں کی صحبت سے ہوتے ہوئے باہر اپنی میزبان کے پاس پہنچ گئے وہ ایک نابینا کتے والے کا انٹرویو کر رہی تھی۔ ہم جلدی سے اس کی ویگن میں بیٹھ گئے اور وہ گاڑی شہر کے راستوں پر دوڑانے لگی۔ ہماری آج پہلی ملاقات یونیورسٹی آف لاس ویل سکول آف ایجوکیشن کے ڈاکٹر جوزف پیئر سے ہوئی تھی۔ وہ ایک خاصا معلوماتی فرد تھا۔ اس نے ہمیں 1990 کا ریفارمز ایکٹ دیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ تعلیم کو مقامی سطح پر لا سکیں۔ جس میں آبادی اور علاقے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہیں اور 90 کے ایکٹ کے بعد فنڈز میں اضافہ ہوا ہے ہم کوئی ایک جیسا امتحان نہیں لیتے۔ جبکہ مختلف سطح پر ترقیاتی کام ہو رہا ہوتا ہے۔ سکول کی سطح پر ذمہ داریوں کا احساس کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ٹیچر یونین بھی ہیں اور وہ ہر سطح پر ڈائیلاگ کرتے ہیں۔ اساتذہ کی تربیت بھی مقامی سکول کی ضروریات کے مطابق ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہم پلانیٹوریم گئے جو کہ آسمان نما بنا ہوا جال تھا۔جس میں سلائیڈ کے ذریعے سیارے ستارے اوران کی حرکات اور سکنات بنائی گئی تھیں۔ یہاں کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس قسم کے جو کہ چار بلین ڈالر سے تیار ہوتے ہیں۔امریکہ میں تین سو ہیں اور ہم اب اس کو سکولوں کی سطح پر دے رہے ہیں۔ یہاں پر مختلف سکول آتے ہیں۔لوگ بھی آتے ہیں اور ہم سائنس کی تعلیم دیتے ہیں۔اس سکرین پر انسان کے غار سے محل تک کا سفر بھی دکھا سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم سپیڈ آرٹ گئے جو کہ ایک اور حیران کن جگہ تھی باہر میوزیم تھے جس میں مادرزاد ننگی تصاویر، ممتا اور محبت کی داستانوں کی تصویریں تھیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سامان تھا۔ یہاں ہمیں دو لوگوں نے خوش آمدید کہا جو کہ نوجوان لڑکا اور لڑکی تھے۔انھوں نے ہمیں مختلف گیمز اور آرٹ پروگرام دیکھائے جس سے بچے سیکھتے ہیں۔اپنی تصاویر بناتے، وڈیوں میں ریکارڈ کرواتے ہیں۔ناچتے ہیں اور وہ ورکشاپ بھی دکھائی جہاں والدین یا دیگر رضا کار ان چیزوں کو ڈیزائن بنانے میں مدد کرتے ہیں۔

شام کو ایک مارکیٹ گئے ۔ وہاں بہت سامان خریدا کیونکہ اگلا دن آزادی کا تھا۔ کیونکہ 4 جولائی کو امریکہ آزاد ہوا تھا اس لیے کھانے پینے کے لیے ایڈوانس چیزیں لینی پڑیں۔ رات کو یوم آزادی کی خوشی میں آتش بازی ہوئی جو کہ بہت دلکش لگی۔

4-7-02

دن بھر کوئی کام نہیں کیا سوائے کپڑے دھونے استری کرنے اور کھانے پکانے کے۔شام میں چند لوگوں کا پروگرام تھا کہ دریا کے کنارے جائیں گے۔لیکن اسی وقت

TV پر ایک خبر نشر ہوئی کہ امریکی ریاست لاس اینجلس میں ایک دہشت گرد کو اسرائیلی ڈسک کے سامنے ائیر پورٹ پر ماردیا گیا اس کے پاس سے دو بندوقیں اور ایک چاقو برآمد ہوا جو کہ دہشت گردی کی غرض سے لایا گیا تھا۔ایک گارڈ اور دو شہری بھی مر گئے۔امریکی حکام کا کہنا تھا کہ ہمیں یہ دھمکی موصول ہوئی ہے کہ چار جولائی کو دہشت گردی کی جائے گی۔لہٰذا تمام ہوائی اڈوں پر سکیورٹی سخت کر دی جائے۔جس کے نتیجے میں یہ بندہ ائیر پورٹ میں داخل ہوا اور ہم نے ماردیا۔حیرت کی بات یہ تھی کہ اگر اس کے پاس بندوقیں تھی تو وہ ائیر پورٹ میں کیوں داخل ہوا وہ کہیں بھی دہشت گردی کرسکتا تھا۔میڈیا کی خبروں کی وجہ سے پوری امریکی قوم خوف کا شکار تھی اور ہمارے ساتھی بھی باہر جانے سے قطرانے لگے۔لیکن مجھ سے رہا نہ گیا اور رات کا کھانا کھا کر اپنا ٹریک سوٹ پہن کر دریا کے کنارے اکیلا چل پڑا۔ بڑے عجیب منظر دیکھنے میں آئے۔جو کبھی فلموں میں نظر آتے تھے۔امریکن خواتین وحضرات بانہوں میں بانہیں ڈال کر دریا کے کنارے لطف اندوز ہو رہے تھے۔میں ان کو دیکھتا ہوا خراماں خراماں چلتا رہا اور اس باغ میں پہنچ گیا جہاں رقص و سرور کی محفل تھی اور اسی کے سامنے آتش بازی کا مظاہرہ بھی ہونا تھا۔

سٹیج پر چند نوجوان موسیقی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور امریکی بچے اس پر رقص کر رہے تھے میں بھی اس رنگینی میں اکیلے شامل ہو گیا اور دل پشاوری کیا۔نوجوان لڑکے اور لڑکیاں پنڈال سے سٹیج والوں کا ردعمل دیکھتے چیخیں مار رہے تھے پی، پلا رہے تھے، پپیاں، چھپیاں چل رہی تھیں اور اس دوران آتش بازی کا مظاہرہ شروع ہو گیا اور لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے ۔ دریا کے درمیان میں کشتی کھڑی تھی جس سے گولے فضا میں چھوڑے جا رہے تھے اور آسمان رنگین ہو جاتا تھا۔ایک رنگ جم گیا نیچے محفل رنگین اوپر آسمان شراب

وشباب ۔میرے ذہن میں فیض کا ایک مصرع گھوم رہا تھا۔" تم اس حسن کے لطف وکرم پر کتنے دن اتراؤ گے"

کافی دیر تک یہ مظاہرے ہوتے رہے اور گھنٹے بھر بعد جب بند ہو گئے ۔تو لوگ اپنا اتارا ہوا سامان اٹھا کر چلنے لگے میں بھی اس بھیڑ میں ہوٹل کی طرف چل پڑا راستے میں ایک جگہ سے آئس کریم لی اور پھر بوجھل قدموں سے آئس کریم کا لطف اٹھاتے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

5-7-02

حسب معمول ہماری میزبان 8:30 پر ہوٹل کے کار پورچ میں اپنی ویگن لیکر پہنچ گئی ہمارے ساتھی بھی تیار تھے صرف ہماری گائیڈ نہیں تھی جس کے انتظار کے لیے کھڑے ہو گئے ۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اپنی میزبان کو پاکستان کا ایک تحفہ جو کہ ماربل کا بنا ہوا کچھوا تھا پیش کیا۔جس کو اس نے بڑی خوشی سے قبول کیا اور میرا شکریہ ادا کیا ۔ہم سب دریا کے اس پار انڈیانا یونیورسٹی کے لیے چل دیئے۔اور وہ حسب عادت شہر کی مشہور جگہیں ہمیں دیکھا رہی تھی ۔لیکن یہ ہمارے لیئے بے فائدہ تھا کیونکہ پہلے دن سے فرنٹ سیٹ پر جیکی نے قبضہ کیا ہوا تھا جبکہ دوسری اور تیسری سیٹ پر ہماری خواتین نے اور آخری سیٹ پر ہم بے چارے دو مرد ۔ہم باہر شیشے سے خود دیکھ کر اندازے لگاتے کہ یہ کیا ہے۔کبھی کبھی ایک آدھ بات ہمارے کانوں تک پہنچا دی جاتی اور یوں ہم شریک محفل رہے۔ہم یونیورسٹی پہنچ گئے وہاں پر دو پکی عمر کی خواتین کارین اور مارگریٹ نے ہمیں خوش آمدید کہا اور سوال جواب کے ذریعے اس یونیورسٹی کی کارکردگی بتائی۔

اس نے بتایا کہ ہمارا زیادہ تر فیلڈ ٹیچنگ ہے ۔ہم 12 سال پڑھائی کے بعد چار سال تک ٹیچنگ سرٹیفیکٹ ڈپلومہ کرواتے ہیں جس میں پرائمری اور سیکنڈری کے لیے الگ الگ لائسنس جاری کیئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ٹیچر کی تنخواہ دیگر پروفیشنل کی تنخواہ کے برابر ہے جو کہ 25، 30 ہزار ڈالر سالانہ سے شروع ہوتی ہے اور 50، 60 ہزار ڈالر تک جاتی ہے ۔انھوں نے بتایا کہ انڈیانا سٹیٹ میں بھی میکنٹ اور چارٹر سکول ہیں ۔ہم نے ملٹی کلچرل مضامین بھی شروع کیئے ہوئے ہیں کیونکہ جس کلاس میں جتنے بچے ہونگے اتنے ان کے کلچر ہونگے اس کو ہینڈل کرنے کے لیے یہ سلسلہ ہم نے شروع کیا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ ہمارے ہاں اساتذہ کی تنظیم مظبوط ہے اور پرائیویٹ سکولوں کی اور مذہبی سکولوں کی تعلیم بہت بہتر ہے لیکن مہنگی ہے ۔ چارٹرڈ سکول کے بارے میں بتایا کہ چونکہ سٹیٹ اپنا حصہ اسے دیتی ہے جو کہ بچوں کی 98 فیصد حاضری پر ہوتا ہے اس سے کم حاضری والے کے لیے رقم کم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں سکول بورڈ کی جگہ سکول کارپوریشن ہے لیکن کام ایک جیسا ہے اور ایجوکیشن ٹریننگ سسٹم ETS بھی ہے ۔سرٹیفیکٹ ٹیچنگ کا متبادل بھی ہے۔

اس کے بعد ہم واپسی کے لیے چل پڑے۔ روتھ ہمیں اپنے دفتر لے گئی جہاں سے ہم نے ای میل چیک کی ۔اس کے بعد ہم گرین ہاؤس گئے جہاں پر دو خواتین نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں بریفنگ دی ایک چینی خاتون لا لائنگ ہانگ پپر ہمارے ساتھ رہی اور اس نے ہمیں بتایا کہ ہم یہاں ایشیاء کے چار ممالک کا کلچر بچوں کو بتاتے ہیں۔ جاپان، چائنا، کوریا اور انڈیا۔

یہاں تعلیم مفت ہوتی ہے اور بچے آتے ہیں یہاں ایشین فیسٹول ہوتا ہے۔ لٹریچر، بدھ ازم، تاریخ چائنا، چائنا کے کھانے ہائی سکول کلچر، لٹریچر، جاپان، کوریا اور انڈیا کے بارے میں مختلف معلومات دی جاتی ہیں۔

انھوں نے ہمیں گیلری دکھائی جس میں چار ممالک کی تہذیب وثقافت کی مختلف اشیاء شوکیسوں میں سجائی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہمیں ورکشاپ بھی دیکھائی جہاں پر یہ چیزیں بنائی جارہی تھیں اور جو کہ فروخت کے لیے بھی موجود تھیں۔ شاہجہان کا تاج محل، رام کے بت، مہندی، چوڑیاں یہ سب اشیاء انڈین کلچر میں وہاں پر موجود تھی۔

6-7-02

ایک اور دن بے کار گزرا۔ صبح میں کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ شام میں بھی نہیں تھی ۔لیکن روتھ نے کہا تھا کہ میں کل آؤں گی اور آپ سب کو بازار لیکر جاؤں گی ۔ جہاں مارکیٹیں ہیں، بکس شاپس ہیں اور سینما گھر بھی۔ جو مرضی وہاں کرنا ہم ڈیڑھ بجے ہوٹل سے نکلے اور دو بجے مارکیٹ پہنچ گئے ۔ راستے میں حسب معمول روتھ مختلف جگہوں کے بارے میں بتاتی رہی مارکیٹ میں پہنچ کر یہ فیصلہ ہوا کہ 6 بجے روتھ ہمیں لینے آئے گی کچھ لوگ سینما گھر چلے گئے اور کچھ بک سٹال پر اور کچھ جنرل سٹور پر۔ یہاں ایک ایک سٹور تین تین ، چار چار کنال میں ہوتا اور ایک چھت کے نیچے آپ کو دنیا جہان کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ جس پورشن میں جاؤ ایک نیا جہان ہے ہماری خواتین ارادہ باندھ کر گئی تھیں کہ کچھ نہیں خریدیں گی لیکن ان سے رہا نہ گیا۔ تقریباً تمام نے کچھ نہ کچھ خریدا۔ بشمول ہمارے۔ جس پر جیکی نے شکریہ ادا کیا کہ ہماری اکانومی کو فائدہ پہنچایا۔

واپسی پر ہم نے جانوروں کے کچھ باڑے دیکھے اور 7 بجے ہوٹل پہنچ گئے ہماری خواتین نے کتوں کے خوف سے ایک ایسا راستہ تلاش کرلیا تھا جس کا پتہ بہت کم لوگوں کو تھا لہٰذا ہم نے اپنا خفیہ راستہ پکڑا اور اپنے اپنے کمروں میں پہنچ گئے۔

رات کا کھانا طے ہوا تھا کہ ہمارے کمرے میں کھایا جائے گا لیکن اچانک فیصلہ تبدیل ہوا اور باہر کھانے کا فیصلہ ہوا ہم سب لوگ 8 بجے ایک فوڈ مارکیٹ میں پہنچ گئے۔ لیکن امریکی چھ بجے رات کا کھانا کھا کر دوکانیں بند کردیتے ہیں اور ہمیں مایوسی ہوئی ایک دو جگہیں اور دیکھیں لیکن پسند نہیں آئیں اور پھر فیصلہ ہوا کہ کمروں میں جو کچھ موجود ہے اکٹھا کریں اور اپنا پکا کر کھائیں گے۔ سب نے واپسی کا راستہ اختیار کیا اور پکانے، کھانے پر لگ گئے۔

7-7-02

صبح کے وقت اپارٹمنٹ میں رہے۔ ساڑھے بارہ بجے سامنے دریا میں بھاپ سے چلنے والی جہاز نما کشتی میں سیر کے لیے پہنچ گئے۔ اس کا ٹکٹ 10 ڈالر کا تھا۔ ہم لوگوں نے خریدا اور بیٹھ گئے۔ جہاز کے دروازے پر ایک بہت خوبرو خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد مقامی وقت کے مطابق ایک بجے جہاز چل پڑا اور کچھ ساتھی پہلی منزل پر اور کچھ دوسری منزل پر بیٹھ گئے اس میں تقریباً دوسو افراد سے زائد لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ جہاز چل پڑا ایک دو لوہے کے پرانے پلوں کے نیچے سے گزرتا ہوا۔ آہستہ آہستہ چل رہا تھا جس لڑکی نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا وہ کمنٹری کررہی تھی اور جہاز کی تاریخ اور مختلف مقامات کے بارے میں بتایا۔ کچھ لوگوں سے سوال جواب بھی کررہی تھی۔ جہاز پر ایک خاندان موجود تھا جن کے بچے کی سالگرہ تھی اور ان بچوں نے اپنی

سالگرہ جہاز پر منائی۔

جہاز ایک گھنٹے تک چلتا رہا اور اس دوران قریب سے گزرنے والے چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہماری طرف ہاتھ ہلاتیں اور ہم بھی جواب میں ہاتھ ہلا دیتے۔مختلف لوگ ادھر سے ادھر ہوتے رہے اور تصاویر وغیرہ بنواتے رہے تین بجے واپسی ہوگئی۔

چار بجے ہم ایک جگہ کھانے پر مدعو تھے اور وہ انڈیانا یونیورسٹی کی سابقہ استاد تھی۔ہم انڈیانا یونیورسٹی پہنچ گئے انھوں نے پہلے ہمیں یونیورسٹی کے کچھ پورشن دیکھائے جس میں لائبریری،کمپیوٹر لیب،مٹی سے بنانے والی اشیاء کی جگہ،کلاس روم وغیرہ۔

تمام چیزیں انتہائی جدید تھی اور بہت ایڈوانس جن کو دیکھ کر ہمارے ساتھیوں کو رشک آتا تھا اور آہیں بھرتے کہ اے کاش پاکستان میں بھی یہ سب کچھ اس طرح ہو جائے۔گھنٹے بھر کے وزٹ کے بعد ہم اپنی میزبان کلیڈا کے گھر روانہ ہو گئے اس کا گھر درختوں کے درمیان میں تھا۔جب ہم اپنی گاڑی سے اترے تو سب سے پہلے نظر ہماری گوتم بدھ پر پڑی،جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو چاروں طرف بے شمار چھوٹے چھوٹے ڈیکوریشن پیس ،دیواروں پر منبروں پر، الماریوں میں سجائے ہوئے تھے اور بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ہم باہر بالکونی میں بیٹھ گئے جس میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔تھوڑی دیر بعد پاپڑ،نمکو اور چٹنی وغیرہ رکھی گئی ہم لوگوں نے تھوڑا تھوڑا لیا۔اس دوران ہماری ایک ساتھی رومانہ نے پاکستان سے لائی ہوئی خواتین کی فلم دیکھائی کہ وہ کیا کام کرتی ہیں۔تعارف ہوا ہمارے علاوہ تین،چار مزید لوگوں کو بھی بلایا گیا تھا۔پھر کھانے کا دور شروع ہوا اور آخر میں سویٹ ڈش اور کافی پلائی گئی۔

کلیڈا نے ہمیں بعد میں گھر کا نیچے والا اور اوپر والا پورشن دکھایا۔نیچے والی جگہ پر بے شمار گڑیا،تصاویر وغیرہ تھیں جبکہ اوپر والے کمرے میں انتہائی سلیقے سے لگا ہوا ڈبل بیڈ اور سجایا ہوا غسل خانہ،باتھ روم وغیرہ تھے۔یہ تمام چیزیں دو،تین مرلے کے لکڑی کے بنے ہوئے گھر میں تھی۔جس کی اونچائی بھی بمشکل 30 فٹ ہوگی اور ہر چیز کو اتنے سلیقے سے بنایا گیا تھا اور رکھا گیا تھا کہ حیرت ہو رہی تھی کہ ان سب کی دیکھ بھال کیسے ہوتی ہے کیونکہ گھر میں یہ دو میاں بیوی تھے اور دونوں کی عمر 60 سے زیادہ تھی۔

8-7-02

آج ہماری پہلی ملاقات ایجوکیشن پروفیشنل سٹینڈرڈ بورڈ سے تھی جو کہ ہمارے ہوٹل سے ایک گھنٹہ ڈرائیو پر تھا جس کے لیے ہمیں پونے آٹھ بجے نکلنا تھا۔ہم جب پہنچے تو جو لوگ ہمارا انتظار کر رہے تھے رسمی تعارف کے بعد ان سب نے باری باری اپنے شعبے کے بارے میں پریزنٹیشن دی۔انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ کس طرح ایک ٹیچر کی نامزدگی کرتے ہیں کہ ایک سال کے لیے ایک ٹیچر کو رکھا جاتا ہے اور اس دوران اسے 1400 ڈالر ماہانہ ملتے ہیں اور آخر میں ہیڈ ٹیچر اور بچوں کی جانچ پڑتال سے منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔اگر کوئی ٹیچر پہلی دفعہ ناکام ہو تو دوبارہ اسے موقع دیا جاتا ہے۔لیکن دوسری بار ناکام ہو تو اس ریاست میں ٹیچنگ کے شعبے کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔مختلف ٹیچر سرٹیفکیٹ کے بارے میں بتایا گیا اور یہ بھی کہ ہمارا ٹیچنگ سرٹیفکیٹ پانچ سال کا ہوتا ہے اور ہم شارٹ کورسز بھی کرواتے ہیں جسے ایمرجنسی سرٹیفکیٹ کہتے ہیں ان میں ٹیکنالوجی، الیکٹرونک،میڈیا،ٹرانس سکرپٹ وغیرہ کے کورسز بھی کروائے جاتے ہیں۔یہ بھی بتایا کہ

اساتذہ کے میٹنگ کی کیا طریقے کار ہیں 15 مختلف شیٹ لیئے جاتے ہیں۔جس کے لیے طلباء کی حاضری اور اساتذہ کی پر کارکردگی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ online ٹریننگ بھی ہوتی ہے۔ٹیچر بہت کم چھوڑ کر جاتی ہیں۔ہم میتھوڈالوجی کی جگہ ٹیکنالوجی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ٹیکنالوجی کو پڑھانے کے لیے ہر کلاس روم میں کم ازکم ایک کمپیوٹر لازمی ہوتا ہے اور سکولوں کی آپس میں نیٹ ورکنگ بھی ہے۔

ہمیں سپرنٹینڈنٹ کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک ڈسٹرکٹ میں 176 ہیں اور ان کی نامزدگی سکول بورڈ کم ازکم ایک سال کے لیے اور زیادہ سے زیادہ چار سال کے لیے کرتا ہے۔سکول بورڈ ٹیچر کا ہائر اینڈ فائر کرسکتا ہے۔دوپہر کو ہم لوگ اپنے ایک ساتھی کے اسرار پر ابراہام لنکن کی جائے پیدائش اور گاؤں گئے۔جو دو گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ہم پہلے اس مقام پر گئے جہاں اس نے بچپن میں پانچ سال گزارے تھے اور وہ تاریخی مکان دیکھا جو ایک کمرے پر مشتمل تھا جس میں ایک دروازہ ، ایک کھڑکی تھی۔جو زیادہ سے زیادہ 10 فٹ چوڑا اور 8 فٹ لمبا ہوگا۔پھر ہم اس جگہ پر گئے جہاں اسکی جائے پیدائش تھی۔اور جس جگہ سے وہ پانی استعمال کرتا تھا۔ابراہام کی نسل ختم ہوچکی ہے۔کیونکہ شجرۂ نسب کے مطابق اس کی اخری چار اولاد کی آگے کوئی اولاد نہیں ہے۔ابراہام لنکن کی جائے پیدائش سے ہم برنن گئے جو کہ ایک جنگل ہے۔30 میل پر پھیلا ہوا اور جو ایک شخص نے عطیہ دیا جو کہ جرمنی سے غربت میں آیا تھا اور یہاں وسکی کے کارخانے سے ایسا مالدار ہوگیا تھا کہ یہ 15 ہزار ایکڑ کا جنگل خرید لیا اور بعد میں ایک غیر سرکاری تنظیم کو عطیہ کے طور پر دے دیا اور اب یہاں ریسرچ پروگرام ہوتا ہے۔

یہاں پر ایک نوجوان نے ہمیں بریفنگ دی۔اگر چہ کچھ دیر کے لیے اس کا

ڈائریکٹر بھی آیا تھا۔لیکن زیادہ تر وقت یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہا۔اس نے ہمیں بتایا کہ ہم نے مختلف جگہوں سے سات ہزار پودے یہاں اکٹھے کیے ہیں۔ہم کچھ جگہ سے درخت ہٹا کر پھر تجزیہ کرتے ہیں کہ بغیر درخت اور درختوں والی جگہ میں کیا فرق ہے۔ہمیں پھر مختلف درخت اور پودے دیکھائے گئے۔جن کے ساتھ بڑے سلیقے سے ہر ایک کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ہمیں مصنوعی اور پھر قدرتی جنگل بھی دیکھایا گیا اور جہاں پر ہر درخت گر گیا تھا اس علاقے میں ہونے والے نقصانات سے آگاہ کیا۔

9-7-02

کنٹکی سے الوداع کا دن تھا۔سب نے تیاری پکڑی اور ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے کے بعد باہر روتھ کا انتظار کرنے لگے۔ہمارے سامان کے باعث روتھ نے ایک گاڑی بھی بلائی تھی۔لیکن رُوتھ آج پہلی مرتبہ لیٹ تھی۔ہم لوگ انتظار کرتے رہے بالآخر 10 منٹ کے بعد روتھ آ گئی۔ہم دو گاڑیوں میں مع سامان کے سوار ہوکر ائیرپورٹ کی طرف چل پڑے۔ائیرپورٹ پر روتھ نے اجازت لی۔سب نے گرمجوشی سے گلے ملکر روتھ سے اجازت لی۔لائن میں ہم بھی کھڑے تھے اور روتھ ہم سے بھی گلے ملنا چاہتی تھی۔لیکن ہائے بیچاری قسمت ہماری! خواتین اور بالخصوص ڈاکٹر ہارونہ نے منع کردیا کہ ہمارے کلچر میں مرد عورت گلے نہیں ملتے ہیں اور پوری محفل کشت زعفران بن گئی بالاخر ہم نے ہاتھ ملانے پر گزارہ کیا اور ائیرپورٹ میں داخل ہوگئے۔ائیرپورٹ پر بڑی واجبی سی تلاشی ہوئی ہماری بھی اور سامان کی بھی۔شاید خطرہ ٹل گیا تھا یا چار جولائی امریکہ کا یوم آزادی۔بہرحال ہم جہاز میں بیٹھ گئے۔ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم نے جہاز بدلا اور چار گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اپنی منزل مقصود پہنچ گئے۔جہاں پر ایک بس کے ذریعے ہمیں

ایک ہوٹل پہنچایا گیا اور یہاں پر اگلے پانچ دن گزرنے تھے۔ہمیں ہوٹل میں پروگرام دیا گیا۔ یہاں کا موسم قدرے سرد تھا اور ٹائم کا تین گھنٹے فرق یعنی اگر باقی جگہوں پر پاکستان کے ساتھ 10 گھنٹے کا فرق تھا تو یہاں 13 گھنٹے کا فرق۔ہم پرانے وقت کے مطابق سو گئے جبکہ یہاں ابھی سر شام تھی۔

10-7-02

آج علی الصبح ہم سین ڈئیگو یونیورسٹی گئے جہاں پر ہمیں ڈاکٹر جان نے جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں بتایا ہم جس کمرے میں جا کر بیٹھے اس میں مختلف 36 کیبن بنے ہوئے تھے اور ہر کیبن میں ایک کمپیوٹر، TV اور VCR تھا۔اس کمرے میں ملٹی میڈیا پروجیکشن سسٹم بھی لگا ہوا تھا۔تمام کمپیوٹر ایک نیٹ ورک کے ساتھ جوڑے گئے تھے۔ڈاکٹر جان نے ٹیکنالوجی کی اہمیت اور مشکلات کے بارے میں بتایا۔کہ آپ کے پاس کتنا وقت ہے، پیسہ ہے، ریسورس ہے، لوگ کتنا ٹیکنالوجی کے بارے میں جانتے ہیں اس کے بعد ٹیکنالوجی مختلف طریقے سے آپ استعمال کر سکتے ہیں ۔ مائیکرو میڈیا نیٹ ورکنگ، انٹرنیٹ، آن لائن، ویڈیو، کیمرا، سافٹ وئیر ٹیچر ٹریننگ، ویب پیج وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔ہم سٹوڈنٹ کو پہلے سے گائیڈ کر دیتے ہیں کہ کون سے ویب پیج ان کے لیے معاون ہیں اس طرح ان کا وقت بچتا ہے اور پھر مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہوتا ہے۔ میتھ ، سائنس، وغیرہ اس کے علاوہ بے شمار طریقے انھوں نے بتائے کلاس روم میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے۔اس کے بعد ہمیں سین ڈئیگو بریفنگ دی گئی۔

کھانے کے بعد ہمیں سین ڈئیگو مختلف علاقے دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ سمندر کا کنارہ مختلف تاریخی مقامات ہوٹل اور بازار دیگر اہم عمارتیں اور آخر میں چڑیا گھر کو

باہر سے دیکھایا گیا۔

11-7-02

ہم صبح ہی سین ڈئیگو کاؤنٹی ایجوکیشن آفس پہنچ گئے۔ جو کہ مقامی سکول ڈسٹرکٹ کے مدد کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ہمیں سب سے پہلے ایک دیوار دکھائی گئی۔جس میں 4X4 کی سکرین لگی ہوئی تھی اور مختلف پروگرام آرہے تھے۔اس کے ایک کونے پر پاکستانی ماہر تعلیم کو خوش آمدید لکھا گیا تھا۔ہمیں ایک جدید کمپیوٹر لیب دکھایا گیا۔جس میں دس دن قبل ایپل نام کے کمپیوٹر نصب کیے تھے اور پھر ایک اور لیب دیکھائی گئی جو کہ 3,4 سالہ پرانے کمپیوٹر تھے۔جن کو اگلے ایک ماہ میں بدلنا تھا۔اور پرانے کمپیوٹر کسی مقامی سکول کو چلے جانے تھے۔ان کے پاس اپنا TV سٹیشن بھی تھا۔جو کہ دس سال سے چل رہا تھا۔جس میں ٹیلی فون کی مدد سے آنے والے حساب کے سوالوں کا جواب براہ راست TV پر دیا جاتا۔اور کم از کم سات سو سوال روزانہ موصول ہوتے ہیں جن کا جواب دو ٹیچر دیتے ہیں۔دوران بریفنگ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہم ویڈیو کانفرنس بھی کرتے ہیں اور ویڈیو فلمیں بھی ہمارے پاس ہیں۔جن کی مدد سے پڑھانے میں مدد ملتی ہے۔ہم انٹرنیٹ کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کے زریعے (hint) ہنٹ دیتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں بتایا گیا کہ وہ لوگوں کو ٹیکنالوجی کی طرف راغب کرتے ہیں۔

3 سے 4 بجے

سن ڈائیگو یونیفائیڈ سکول ڈسٹرکٹ کے دفتر گئے۔ جہاں پر چار خواتین نے

اپنے اپنے شعبوں سے متعلق بریفنگ دی۔انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہم سینٹرل مینجمنٹ کی طرف جا رہے ہیں ہمارے پاس نارمل سکول اور ایکسڈ یینٹ سکول ہیں۔ہم 65 فیصد بچوں کو کم قیمت یا فری خوراک دیتے ہیں۔انھوں نے ہمیں ایک چارٹ دیا۔انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ بچوں کے جانچنے کا باقائدہ ایک میتھڈ ہے جس کے لیے نصاب مقرر ہے اور پاس شدہ کتابیں ہیں۔سکول میں سپورٹ پرسن ہوتا ہےPTA بھی سکول میں کردار ادا کرتا ہے۔کمیونٹی تمام معملات میں شامل رہتی ہے۔جبکہ پرنسپل کے تعینات کے معمالے میں بھی معاونت کرتی ہے۔

12-7-02

آج صبح ہم سکول ڈسٹرکٹ کے دفتر پہنچ گئے۔جہاں پر سپریٹنڈنٹ اسسٹنٹ سپریٹنڈنٹ اور دیگر افسران ہمارا انتظار کر رہے تھے۔یہ ایک خوبصورت دفتر تھا جس میں مختلف جگہوں پر کامیاب اور بہترین اساتذہ کی تصاویر،بچوں کے مقابلے کی پینٹنگ وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ہمیں بتایا گیا کہ کس طرح بتدریج استاد کی تنخواہ میں اضافہ کیا گیا یعنی 1982 میں سالانہ 18 ہزار ڈالر تھی جبکہ 91 میں 32 ہوئی اور اب 45 تک پہنچ گئی ہے۔5 سکولوں میں گرمیوں کی سرگرمیاں پڑھنے کے لیے دو کروڑ ڈالر خرچ کیا گیا اور معیار کو بتدریج تیز بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔جس میں پہلے 44% تھی اب 57.5% تک چلی گئی ہے۔فری لنچ اور جوس میں اب لوگوں نے پوری ادائیگی شروع کر دی۔انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ہم نہ صرف کمیونٹی کو سکول میں شامل رکھتے ہیں بلکہ دیگر ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بھی روابط رکھتے ہیں جس طرح کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ ہے۔جس کے 20 افسران ہمارے پارٹنر ہیں وہ بچوں کو گرفتار کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ معمول کے

معملات میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔یہ بھی بتایا کہ بچوں کے معیار کو جانچنے کے لیے والدین سے فون پر بات کی جاتی ہے اور اخبار میں بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ایک خاتون سے بھی ملا دیا گیا جو کہ ٹیچر ہیں،ماں بھی اور سکول بورڈ کی صدر بھی چار سال کے لیے منتخب ہوئی ہیں۔انھوں نے ہمیں بتایا کہ نہ صرف نصاب بلکہ تمام معملات میں والدین شامل ہوتے ہیں۔ٹیچر کو ایوارڈ بھی دیا جاتا ہے اور سکول ڈسٹرکٹ میں ان کی لسٹ بھی لگائی جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم سکول لے جایا گیا۔جہاں سکول پرنسپل وفد کے آمد کی انتظار کر رہی تھی۔ہمیں ایک کلاس روم میں لے جایا گیا جہاں پر بچے کمپیوٹر کی مدد سے ریاضی کے سوال حل کر رہے تھے اور ہر بچے حصہ لے رہا تھا۔بچوں نے چند سوالات بھی پوچھے کہ آپ کا جھنڈا کس قسم کا ہے؟ کتنا دور ہے وغیرہ پھر ہم ایک اور کلاس روم میں گئے جہاں پر مختلف کلاس کے بچے بیٹھے ہوئے تھے اور تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

اس کے بعد ہمیں ایک اور سکول میں لے جایا گیا جس کی پرنسپل ایک جاپانی خاتون تھی اور وہ ہمیں ایک ہال میں لے گئی جہاں 100 سے زیادہ بچے فلم،TV پر دیکھ رہے تھے۔اس کے بعد وہ ہمیں ایک اور کلاس روم میں لے گئی جہاں بچوں کو تعلیم دینے کی اشیاء موجود تھی۔پھر قریبی ایک اور بلڈنگ میں لے گئی جو کہ فیملی ریسورس سینٹر تھا۔جہاں پر والدین آتے ہیں اور ان کے ساتھ مختلف مسائل پر بات چیت کی جاتی ہے۔ان کو صحت کی سہولیات،روزگار،ہنر،سماجی معاملات کے حل کے لیے روزگار مقامی NGO اور سٹاف موجود ہے۔جن کا کام ہی یہی ہے کہ وہ لوگوں کو مناسب رہنمائی کریں اور مختلف سہولیات پہنچائیں۔دوپہر کا کھانا سکول ڈسٹرکٹ کی طرف سے تھا۔اس کے بعد ہم نیشنل یونیورسٹی

چلے گئے جہاں پر دو افراد نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں پرزنٹیشن دی۔انھوں نے بتایا کہ گزشتہ 30 سال سے یہ یونیورسٹی چل رہی ہے جو واشنگٹن سے متعلق ہے اور ہر سٹیٹ پالیسی پر عمل درآمد کرتے ہیں۔

13-7-02

آج کا دن فارغ تھا۔ہم لوگوں نے دس بجے ناشتہ کیا ہم نے 5 ڈالر کا ڈے پاس لیا اور ٹرالی میں بیٹھ گئے ۔ہم اولڈ ٹاؤن گئے جہاں مختلف بازار اور کھانوں کے سٹال دیکھے اور ایک جگہ سے ایک ڈالر کے دو دو پراٹھے لیکر مکھن کے ساتھ کھائے پھر واپس اپنے ہوٹل پہنچ گئے اور شام تک سوئے رہے اس کے بعد پھر اپنے سامان کی پیکنگ کی کیونکہ اگلے دن صبح ہم نے 5 بجے ائیر پورٹ جانا تھا اور ایک لمبے سفر کے لیے تیار ہونا تھا۔کل ہم بعد دوپہر 3،4 بجے واشنگٹن پہنچ جائیں گے جو کہ ہمارا آخری سٹاپ ہے۔

14-7-02

سامان باندھا صبح 4 بجے ہوٹل سے تیار ہونا تھا اور 5 بجے نکلنا تھا۔سب لوگ تیار ہو کر آ گئے اور ہم نے ائیر پورٹ کا راستہ لیا۔آدھے گھنٹے کے بعد ائیر پورٹ پہنچ گئے ۔ معمولی چیکنگ کے بعد ہم ائیر پورٹ میں داخل ہو گئے ۔ جہاز میں سوار ہوئے ۔5 گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد ہم واشنگٹن ائیر پورٹ پر اتر گئے ۔ جہاں پر گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی ۔ہم سب سوار ہوئے اور آدھے گھنٹے کے بعد ہوٹل پہنچ گئے ۔تمام لوگ تھکے ہوئے تھے اور اپنے اپنے کمروں میں گئے اور آرام کرنے لگے۔

15-7-02

صبح 9 بجے ہم راک کریک انٹرنیشنل سکول گئے ۔ جہاں پر والدین اپنے بچوں کو چھوڑنے آ رہے تھے ۔ایک بچی سکول آنے پر رو رہی تھی اور ماں اسے واپس لے جا رہی تھی سکول میں فارسی ،عربی اور انگریزی زبان پڑھائی جا رہی تھی ۔ہم مختلف کلاس روم میں گئے اور بچے سیکھ رہے تھے ۔ یہ سمر کیمپ تھا۔اور دوسرا دن تھا۔انھوں نے ہمیں ٹیکنالوجی کے بارے میں بتایا جو کہ بچوں کی نجی زندگی اور سکول کے متعلق پینٹنگ پر تھا۔انھوں نے ہمیں بتایا کہ ٹیکنالوجی اور نصاب کو اکٹھا کرنے میں مسائل آ رہے ہیں پھر انھوں نے اساتذہ اور والدین کے رابطے کے بارے میں بھی بتایا۔

17-7-02

آج صبح ہم آئی آئی ای کے دفتر پہنچے جہاں پر USAID ایشیاء فاؤنڈیشن ،CRI اور یو۔ایس ایڈ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندوں نے ہمارے ساتھ میٹنگ کی ۔ ان لوگوں نے اپنی اپنی پرزنٹیشن دی اور بتایا کہ کس طرح ہم پاکستان میں مختلف پروگراموں میں شامل ہیں سب سے پہلے CRI کی محترمہ جولی نے بتایا کہ ہم نے پاکستان میں CRI کا دفتر بنا لیا ہے۔ٹیم بن گئی ہے اور تین ایریاز میں کام کر رہے ہیں اور دیگر معلومات دی اس پر ڈاکٹر جان نے بتایا کہ وزارت تعلیم کی ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ ہم ESR کے لے مدد چاہتے ہیں میں نے CRI سے بات کی اور پھر کام شروع ہوا۔اس کے بعد سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی خاتون نے پاکستان میں اپنے قیام اور پروگرام کی وضاحت کی ۔ پھر ایشیاء فاؤنڈیشن کی نائب صدر نیسن سی نے بتایا کہ وہ مختلف پروگراموں میں پاکستان میں سپورٹ کو فروغ دے رہی ہیں ۔جس میں دو پمفلٹس بھی اس نے دکھائے ایک کامیاب کہانی Going School اور الفلاح کا بروشر دیکھایا۔آخر میں ڈاکٹر

جان نے بات کی اور بتایا کہ وہ اگست کے آخر میں 100 ملین ڈالر حکومت پاکستان کو دینے والے ہیں۔ باقی آخری دن سارہ ترمذی، سابقہ، ایکشن ایڈ کی کنٹری ڈائیریکٹر نے یہاں سے سیکھے ہوئے عمل اور پاکستان پر بات کی۔ پھر پانچ پانچ کارڈ دیئے گئے اور سب نے اس پر پاکستان میں ہونے والی تبدیلی کے بارے میں لکھا کہ کن کن ایریاز کو ٹارگٹ کرنا چاہیے۔

- ......ٹیچر ٹریننگ
- ......اکاؤنٹ ایبلٹی
- ......کوالٹی
- ......گڈ گورننس

18-7-02

آج ورکشاپ کا دوسرا دن تھا لیکن پہلے سیشن میں ورلڈ بنک اکیڈمی فار ایجوکیشن ڈویلپمنٹ اور ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے نمائندے موجود تھے۔ ورلڈ بنک کے نمائندے نے پاکستان میں ترقیاتی کاموں کے جائزے پیش کیئے اور NRB کے حوالے سے بات کی کہ وہ اختیار کی نچلی سطح پر مستقبل کا کام کر رہے ہیں۔ ایجوکیشن اکیڈمی کے نمائندے نے ٹیکنالوجی کے استعمال اور تعلیمی معیار پر بات کی کہ وفاقی حکومت کے پاس کیا اختیار ہے۔ سٹیٹ کے پاس کیا ہے۔ سکول ڈسٹرکٹ میں کیا کام کر سکتا ہے۔ کھانے کے بعد گزشتہ کل کے ورکشاپ کے سکیل کو آگے بڑھایا گیا اور جن پانچ ایریاز کو منتخب کیا گیا تھا۔ ان کو مزید دو سیکٹر میں تبدیل کیا گیا اور دو گروپ بنا کہ اس پر کام کیا

گیا۔ ہمارے گروپ نے زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اختیارات کی منتقلی پر بات چیت کی اور ان تمام دستیاب وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے درج ذیل تجاویز مرتب کیں۔

- ......سکول کی سطح پر SMC،PTA کو با اختیار بنایا جائے۔
- ......سکول بورڈ ---- بنائے جائیں۔
- ......ڈسٹرکٹ کی سطح پر تعلیم کے لیے فنڈز کو مختص کیا جائے۔
- ......نچلی سطح پر بجٹ بنایا جائے۔
- ......اساتذہ کی تربیت مقامی سطح کی ضروریات سامنے رکھ کر کی جائے۔
- ......انڈسٹریل سائیٹ کو سکولوں میں مالی معاونت پر امادہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا کے علاوہ دیگر قابل عمل تجاویز مرتب کی گئیں تاکہ پاکستان میں تعلیمی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

☆☆☆☆